Registered No. L. 5340

جلد ۲۹

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	برائے پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
" سات روپیہ آٹھ آنے	برائے ہندوستان	" گیارہ آنے

فہرست مضامین

جلد ۲۹	رمضان ۱۳۶۵ھ مطابق اگست ۱۹۴۶ء	عدد ۳

سیدابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر وپبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ۔ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہندوستان میں جس اندرونی فساد کے برپا ہونے کا خطرہ ایک مدت سے لگا ہوا تھا، افسوس ہے کہ اب وہ پھوٹ پڑا ہے اور اس کے بند ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی ہے۔ پہلے تحریک ترک موالات کی ناکامی کے بعد فسادات کا جو ہولناک سلسلہ شروع ہوا تھا اس کے اسباب سطحی تھے۔ چند چھوٹی چھوٹی شکایات اور چند مبہم بدگمانیاں تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیتی تھیں۔ ان میں یہ طاقت نہ تھی کہ ان دونوں قوموں کے درمیان ایک مستقل محاذ جنگ قائم کر دیتیں۔ اس پر بھی انھوں نے چند سال تک ہندوستان کے اندرونی امن کو جس بری طرح خراب کیے رکھا تھا اس کی تلخ یاد اب تک باقی ہے۔ لیکن اب جس فساد کا دروازہ کھلا ہے اس کے اسباب گہرے ہیں۔ صریح طور پر نیشنلزم کی دو تحریکیں پوری طرح نشوونما پاکر، قومی حوصلوں کی انگیخت اور زخمی جذبات کے اشتعال سے بھڑک کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئی ہیں اور یہاں جنگ و خونریزی کے لیے وہی اسباب و محرکات فراہم ہو چکے ہیں جنھوں نے پچھلی جنگ عظیم دنیا میں برپا کی تھی۔ اس لیے اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس قومی کشاکش سے ہندوستان کے باشندوں پر کیسی کچھ تباہی نازل ہوگی اور کتنی مدت تک یہ ہمیں امن سے محروم رکھے گی۔ اس جہنم کی پہلی پھونک نے کلکتہ میں جو رنگ دکھایا ہے اسے اگر ابتدائی نمونہ سمجھا جائے تو یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کیا کچھ تاریک ہے!

جن حالات نے ہندوستان کو بتدریج اس تباہی کے راستے پر چلا کر آج اس جہنم کے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے، وہ اگرچہ سب کی آنکھوں کے سامنے گزرتے رہے ہیں اور ان کے اندر علانیہ وہ تمام علامات نمایاں ہوتی رہی ہیں جو صاف صاف خبر دے رہی تھیں کہ یہ گاڑی کس منزل کی طرف جا رہی ہے، لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے رہنما اور کارفرما اپنے نفس کو اور اپنے اہل وطن کو دھو

ساری دنیا کو یہ فریب دیتے رہے کہ کچھ نہیں، سب خیریت ہے، کوئی حقیقی وجہ نزاع موجود نہیں ہے، یونہی غیر ملکی حکمرانوں کی انگیخت سے چند اوپری اسباب، کشیدگی پیدا ہو گئے ہیں جو "آمدِ آفتاب" طلوع ہوتے ہی خود غائب ہو جائیں گے۔ اس دوران میں اصلاحِ حال کے جتنے مواقع آئے ان سب کو جان بوجھ کر ضائع کیا گیا اور سارے ملک کی آنکھوں میں طرح طرح کی پرفریب باتوں سے خاک جھونکی جاتی رہی۔ پھر اب کہ "آفتابِ حریت" کے جھانکتے ہی علی الاعلان سب کی آنکھوں کے سامنے روشنی کے بجائے تاریکی پھیلتی نظر آرہی ہے، یہ لوگ ان آخری لمحات میں بھی ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے کہ ہم نے کیا غلطی کی ہے اور اس کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کے بجائے اب سارے لیڈر اور اخبار نویس مل کر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے اس جہنم کے دروازے کو کھول دیں اور اپنی زبان سے ثابت کریں کہ ہم تو جنت کا دروازہ کھول رہے ہیں البتہ صرف ہمارا فریقِ مقابل ایسا نالائق ہے کہ جہنم کے فتحِ باب پر اصرار کیے جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کی تہ میں جو اسباب کام کر رہے ہیں ان پر ہمیں اتنی گرفت تو حاصل نہیں ہے کہ ان کو ہم بزور دفع کر سکیں اور اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ ملک کو آنے والی تباہی سے بچا سکیں، لیکن ہمیں خود اپنے ذہن اور عمل کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے تاکہ پوری بصیرت کے ساتھ صحیح طرزِ عمل پر قائم رہ سکیں اور اپنے آپ کو ان سخت آزمائش کے مواقع پر، جو آگے پیش آنے والے ہیں، ہنگامی جذبات کی رو میں بہنے اور اپنی قوتوں کو زیاں کاری میں ضائع کرنے سے بچا سکیں۔

ہندوستان کی مصیبت کا اصل سبب یہ نہیں ہے کہ یہاں عقل، تدبر، یا علم کی کمی ہے، بلکہ اس کا اصلی سبب اخلاقِ صالحہ کا فقدان ہے۔ ایک قسم کا اخلاقی انحطاط تو یہاں

پہلے سے موجود تھا جس کی بدولت ایک اجنبی قوم ہمارے اپنے سرمایے اور آدمیوں کے ذریعہ سے ہم کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہوئی۔ پھر مغرب کی شاگردی نے اس پر مزید چند اخلاقی خرابیوں کا اضافہ کردیا جو ہمارے ملک کی پوری آبادی میں باولے کتے کے زہر کی طرح پھیل گئیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس شاگردی نے ہماری سابق کمزوریوں میں سے بھی کسی کی تلافی نہ کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کے لوگ بہت سی پرانی اور بہت سی نئی کمزوریوں کا مجموعہ بنے ہوئے ہیں۔

آج ہم میں سے ہر گروہ کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں سے انصاف کا طالب ہے مگر خود کسی کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے پاس دوسروں کو جانچنے کے لیے بہت سے اصول موجود ہیں مگر اپنے آپ کو جانچنے کے لیے کوئی اصول موجود نہیں۔ وہ لینے کے لیے بہت بڑا دل رکھتا ہے مگر دینے کے لیے کوئی دل نہیں رکھتا۔ ہر گروہ پر شدت کے ساتھ قومی یا طبقاتی خود غرضی مسلط ہے اور اپنی اغراض کے لیے وہ ہر اس تدبیر کو اختیار کرنا جائز سمجھتا ہے جسے دوسرے اگر اس کے خلاف استعمال کریں تو وہ اسے سخت ناجائز کہے گا۔ اخلاق، دیانت، راستبازی اور انصاف کا نام سب لے رہے ہیں، مگر نہ اس لیے کہ اس پر عمل کریں، بلکہ محض خوشنما الفاظ کی دھونس جماکر دوسروں کو فریب دینے کے لیے۔ عام باشندوں کی اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے اس کا اندازہ ریلوں میں، منڈیوں میں، بازاروں میں، عدالتوں میں، اور دفتروں میں، ہر جگہ ہو رہا ہے۔ دھڑے بندی کے تعصب میں اندھے ہوکر ہندو، مسلمان، سکھ، اچھوت اور دوسرے گروہ جو کچھ ایک دوسرے کے ساتھ کر رہے ہیں اس کا تجربہ بھی زندگی کے ہر شعبے میں، ہر وقت ہر شخص کو ہو رہا ہے۔ ملک کی رائے عام پر سب سے زیادہ جس طبقے کا اثر ہے وہ اخبار نویس ہیں، اور ان سے بڑھ کر فتنہ جو، فتنہ انگیز اور فتنہ پرور طبقہ اس وقت ہندوستان میں اور کوئی نہیں۔ یہ لوگ خدا اور خلق دونوں سے بے شرم ہوکر ہر روز دوسروں کے لیے کچھ زہریلے ڈنک اور اپنوں کے لیے فساد انگیز شراب کے کچھ جام تیار کرتے ہیں اور ملک بھر میں انھیں پھیلا دیتے ہیں۔ پھر ہر قوم نے اپنے اکابر مجرمین کو اپنا رہنما و سربراہ کار بنا رکھا ہے اور وہ اپنی لیڈری کی خیر اسی میں پاتے ہیں کہ جس دھڑے کے وہ سرگروہ ہیں اس کی اغراض کو بالاتر رکھیں۔

ان میں سے ہر ایک انما نحن مصلحون کے بلند بانگ دعوے کر رہا ہے مگر آئے دن ان کے جو کارنامے ہمارے سامنے آ رہے ہیں وہ اس حقیقت پر شہادت دیتے ہیں کہ الا انھم ھم المفسدون۔ ان کی ڈھٹائی کا حال یہ ہے کہ ان کی اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے ملک میں جو آگ لگ چکی ہے اس کو فرو کرنے کی ان میں سے کسی کو فکر نہیں ہے بلکہ ہر ایک دوسرے پر الزام تھوپ کر خود بری الذمہ ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور علانیہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ایسی تدبیریں کیے جاتا ہے جن سے اشتعال اور بڑھے۔

یہ حالت جس ملک کی ہو اس میں اگر خانہ جنگی و برادر کشی کی آگ نہ بھڑکے گی تو کیا امن و عافیت اور ترقی و خوشحالی کے پھول برسیں گے۔ یہ وہی اخلاقی بیماریاں تو ہیں جو یورپ کو لگی تھیں اور آخر کار اس کی اینٹ سے اینٹ بج کر رہی۔ پھر ہم ایسے کونسے فطرت کے چہیتے ہیں کہ انہی بیماریوں کو اپنے اندر پرورش کر کے ان کے نتائج بد سے بچ رہیں۔

اب اگر ہندوستان اس بلا سے بچ سکتا ہے تو اس طرح نہیں کہ یہاں کا ہر ہر شخص جس دھڑے کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتا ہے اس کی حمایت میں آستینیں چڑھا لے اور اس فساد میں حصہ لینے کے لیے یہ عذر پیش کر دے کہ "یہ فیصلے کا وقت ہے، اس میں ہم اپنے گروہ کا ساتھ نہ دیں گے تو خود بھی مٹ جائیں گے"۔ اس طرح تو تنور کو مزید ایندھن فراہم ہوگا، آگ فرو نہ ہوگی۔ در اصل یہ وقت ہے ہندوستان میں مصلحین کے ایک ایسے گروہ کے اٹھنے کا جو تمام شخصی، طبقاتی اور نسلی خود غرضیوں سے بالاتر ہو کر بے لاگ انصاف، بے غرض سچائی اور بے لوث حق پرستی کا علم بلند کرے، زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو میں دیانت، امانت اور راستی خود برتے اور دوسروں کو اس کی دعوت دے، ظلم اور بے انصافی کے سوا اس کی کسی سے دشمنی نہ ہو اور حق و انصاف کے سوا وہ کسی کا دوست بھی نہ ہو، وہ ان کا بھی بھلا چاہے جو اس کا برا چاہیں، ان کے ساتھ بھی امانت برتے جو اس سے خیانت کریں، اور ان

سے بھی انصاف کرے جو اس سے بے انصافی کریں۔ ایسا ایک گروہ اگر پوری طرح منظم ہو کر اٹھ کھڑا ہو اور پھر وہ قومیت، قوم پرستی اور قومی خود غرضیوں کا قلع قمع کر کے جذبے لاگ اور منصفانہ اصولوں کی حکومت اس ملک میں قائم کرنے کی کوشش کرے تو یقین ہے کہ آخر کار اس ملک کے تمام راستی پسند لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے، اور یہاں کے عام باشندے بھی اپنے مصلح نما مفسد لیڈروں کی رہنمائی کے تلخ نتائج بھگت لینے کے بعد اسی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو مستقبل میں ہندوستان کے لیے دور دور تک تاریکی ہی تاریکی ہے، ایسی تاریکی جس کا اندازہ شاید ان لیڈروں اور اخبار نویسوں کو خود بھی نہیں ہے جن کے کرتوتوں سے یہ طوفان اٹھا ہے۔

ہماری تمنا ہے کہ جماعت اسلامی ہی وہ جماعت ہو جو وقت کی اس ضرورت کو پورا کرے۔ مگر یہ چیز تمناؤں سے بڑھ کر بھی کچھ چاہتی ہے۔ اس کے لیے حسن نیت چاہیے، بیدار مغزی اور معاملہ فہمی چاہیے، سخت کوشی، ایثار اور قربانی چاہیے، مضبوط عزم، بلند حوصلہ اور پاک دل چاہیے۔ ان اوصاف کے ساتھ جو جماعت بھی قائمٌ بالقسط اور شہداء للّٰہ علی الناس بن کر اٹھے گی وہی ہندوستان کی نجات دہندہ ثابت ہوگی اور بالآخر اسی کے ہاتھوں میں نہ صرف اس ملک کی زمام کار آئے گی بلکہ دنیا کی رہنمائی کے منصب کا راستہ بھی اس کے لیے کھل جائے گا۔

اعلان از قیم جماعت جماعت اسلامی کی نئی مجلس شوریٰ کے اجتماع کی تاریخیں ۲۷، ۲۸، ستمبر ۱۹۴۶ء مقرر کی گئی ہیں اور اس کے لیے ایجنڈا کیا جا رہا ہے۔ تمام ارکان ۲۶ کی رات تک دار الاسلام پہنچ جائیں۔

تفہیم القرآن

(۳۹)

یوسف

(از ابتدا تا رکوع ۵)

اس سورہ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانۂ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی جبکہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں یا جلا وطن کریں یا قید کر دیں۔ اُس زمانہ میں بعض کفار مکہ نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہوا۔ چونکہ اہل عرب اس قصہ سے ناواقف تھے، اس کا نام و نشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا، اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی ان کا ذکر نہ سنا گیا تھا، اس لیے انھیں توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے، اور اس طرح آپ کا بھرم کھل جائے گا۔ لیکن اس امتحان میں انھیں الٹی منہ کی کھانی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ اپنے نبی پر الہام فرما دیا، بلکہ مزید برآں ٹھیک اس موقع پر جبکہ یہ لوگ آپ کے ساتھ برادرانِ یوسفؑ کا سا معاملہ کر رہے تھے، اس قصے کو ان پر چسپاں بھی کر دیا۔

پس یہ قصہ دو اہم مقاصد پر مشتمل ہے:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور ان کے خود تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ آپ سنی سنائی

باتیں بیان نہیں کرتے بلکہ فی الواقع آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو سورہ کی تمہید میں بھی صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے اور خاتمہ کلام پر بھی پورے زور کے ساتھ اس کی تصریح کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ سرداران قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اُس وقت جو معاملہ چل رہا تھا اس پر برادران یوسفؑ اور یوسف علیہ السلام کے قصے کو چسپاں کرتے ہوئے قریش والوں کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا، مگر جس طرح وہ خدا کی مشیت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار اسی بھائی کے قدموں میں آ رہے جس کو انھوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنوئیں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمہاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور ایک دن تمہیں بھی اپنے اسی بھائی سے رحم و کرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ مقصد بھی سورہ کے آغاز اور اختتام، دونوں میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے، چنانچہ آغاز میں فرمایا کہ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ (یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں) اور آخر میں فرمایا کہ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (ان کے حالات میں ذی ہوش لوگوں کے لیے ایک عبرت آموز سبق ہے)۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کے قصے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے قرآن مجید نے گویا ایک صریح پیشنگوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس سورہ کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ قریش والوں نے برادران یوسف کی طرح محمد صلی اللہ علیہ کے قتل کی سازش کی اور آپ کو مجبوراً ان سے جان بچا کر مکہ سے نکلنا پڑا۔ پھر ان کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو بھی جلاوطنی میں ویسا ہی عروج و اقتدار نصیب ہوا جیسا یوسف علیہ السلام کو ہوا تھا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک ٹھیک

وہی کچھ پیش آیا جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائیوں کی آخری حضوری کے موقع پر پیش آیا تھا۔ وہاں جب برادران یوسف انتہائی عجز و درماندگی کی حالت میں ان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ، "ہم پر صدقہ کیجئے اللہ صدقہ کرنے والوں کو نیک جزا دیتا ہے" تو یوسف علیہ السلام باوجودے کہ ان کے ظلم و ستم کا انتقام لینے پر پوری طرح قادر تھے مگر آپ نے یہ کہہ کر انہیں معاف کر دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔ اسی طرح یہاں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے اور آنحضرت ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپ نے ان سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انھوں نے عرض کیا اخ کریم وابن اخ کریم "آپ ایک عالی ظرف بھائی ہیں، اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں"۔ اس پر آپ نے فرمایا فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوتہ، لا تثریب علیکم الیوم، اذہبوا فانتم الطلقاء۔ "میں تمہیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تمہیں معاف کیا"۔

یہ دو پہلو تو اس سورہ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قصے کو بھی قرآن مجید محض قصہ گوئی و تاریخ نگاری کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق وہ اسے اپنی اصل دعوت کی تبلیغ میں استعمال کرتا ہے۔

وہ اس پوری داستان میں یہ بات نمایاں کرکے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی چیز کی طرف وہ بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے کردار اور دوسری طرف برادران یوسف

قافلۂ تجار، عزیز مصر، اس کی بیوی، بیگمات مصر، اور حکام مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے اور محض اپنے انداز بیان سے سامعین و ناظرین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام، یعنی خدا کی بندگی اور حساب آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت، اور دنیا پرستی اور خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتے ہیں، اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں سے کس نمونے کو پسند کرتا ہے۔

پھر اس قصے سے قرآن حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا مگر نتیجہ میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو کنویں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا، مگر فی الواقع انھوں نے یوسفؑ کو اس بام عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا، اور اپنی اس حرکت سے انھوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسفؑ کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے انھیں ندامت و شرمساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ عزیز مصر کی بیوی یوسفؑ کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو ان سے انتقام لے رہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تخت سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے ملک کی مربیہ کہلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے

بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی، بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور ان لوگوں کے حصہ میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنھوں نے اسے گرانا چاہا تھا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس، خدا جسے گرانا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی، بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں الٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اس حقیقت حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدابیر، دونوں میں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانون الٰہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی و ناکامی تو اللہ کے ہاتھ ہے، لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا وہ اگر ناکام بھی ہوا تو بہرحال ذلت و رسوائی سے دوچار نہ ہوگا، اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا وہ آخرت میں تو یقیناً رسوا ہو گا ہی مگر دنیا میں بھی اس کے لیے رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔ دوسرا اہم سبق اس سے توکل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کا ملتا ہے۔ جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دنیا انھیں مٹا دینے پر تلی ہوئی ہو وہ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو انھیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہوگی، اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دیے چلے جائیں گے۔

اس قصے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی و جغرافی معلومات بھی ناظرین کے پیش نظر رہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب کے بیٹے، حضرت اسحٰق کے پوتے، اور حضرت ابراہیم کے پرپوتے تھے۔ توراۃ کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ ان میں سے حضرت یوسف اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی دس دوسری بیویوں سے تھے۔ فلسطین میں حضرت یعقوب کی جائے قیام حبرون کی وادی میں تھی

جہاں حضرت اسحٰق اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب کی کچھ زمین سِکم میں بھی تھی۔ بائبل کے علماء کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسف کی پیدائش ۱۹۰۶ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس قصہ کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنویں میں پھینکا جانا



حبرون = وہ مقام جہاں حضرت یعقوب رہتے تھے (اس کو الخلیل بھی کہتے ہیں۔)
سِکم = وہ مقام جہاں حضرت یعقوب کی آبائی جائداد تھی۔ (اب اس کا نام نابلس ہے)۔
دوتن = وہ مقام جہاں بائبل کے بیان کے مطابق برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف کو کنویں میں پھینکا
ممفس = یہ اس زمانہ میں مصر کا پایۂ تخت تھا۔
جُشن کا علاقہ = یہ مصر کا وہ علاقہ ہے جہاں بنی اسرائیل آباد کیے گئے تھے۔

اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی۔ جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے وہ بائبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سکم کے شمال میں دوتن کے قریب واقع تھا، اور جس قافلے نے انھیں کنوئیں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آرہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر پر اس زمانہ میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ شام کے رہنے والے سامی النسل تھے۔ عرب مورخین اور مفسرین قرآن نے ان کے لیے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انھیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسف کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر ورسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ اس کے علاوہ مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رواج پائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو "فرعون" کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ "فرعون" مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بائبل میں غلطی سے اس کو بھی "فرعون" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ "فراعنہ" ہی تھے۔

موجودہ زمانہ کے محققین، جنھوں نے بائبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرمانروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں ممفس تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل

کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ جب حضرت یوسف مصر کے حکمراں ہوئے تو انھوں نے حضرت یعقوب کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بائیبل اور تلمود میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، اگر قصے کے اہم اجزا میں تینوں متفق ہیں۔ ہم اپنے حواشی میں حسب ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ا۔ ل۔ ر۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن[1] بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔[2] اے محمد! ہم اس قرآن

---

[1] قرآن مصدر ہے قَرَأَ یَقرأُ سے۔ اس لیے اس کے اصل معنی ہیں "پڑھنا"۔ مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنی مصدری بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کسی شخص کو ہم بہادر کہنے کے بجائے "بہادری" کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر شجاعت ایسی کمال درجہ کی پائی جاتی ہے کہ گویا وہ اور شجاعت ایک چیز ہیں۔ پس اس کتاب کا نام "قرآن" (پڑھنا) رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عام و خاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

[2] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب خصوصیت کے طور پر اہل عرب ہی کے لیے نازل کی گئی ہے، بلکہ اس فقرے کا اصل مدعا یہ ہے کہ اے اہل عرب، تمہیں یہ باتیں کسی یونانی یا ایرانی زبان میں تو نہیں سنائی جا رہی ہیں، تمہاری اپنی زبان ہی میں ہیں، لہٰذا تم نہ تو یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ یہ باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کتاب میں اعجاز کے جو پہلو ہیں، جو اس کے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، وہ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ رہ جائیں۔

بعض لوگ قرآن مجید میں اس طرح کے فقرے دیکھ کر یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ یہ کتاب تو اہل عرب کے لیے ہے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے) تم بالکل ہی بے خبر تھے [۱]

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ "ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں اور دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"، جواب میں اس کے باپ نے کہا، "بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے،[۲] حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) بغیر اہل عرب کے لیے نازل ہی نہیں کی گئی ہے، پھر اسے تمام انسانوں کے لیے ہدایت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ محض ایک سرسری سا اعتراض ہے جو حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر جڑ دیا جاتا ہے۔ انسانوں کی عام ہدایت کے لیے جو چیز بھی پیش کی جائے گی وہ بہرحال انسانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان ہی میں پیش کی جائے گی، اور اس کے پیش کرنے والے کی کوشش یہی ہوگی کہ پہلے وہ اس قوم کو اپنی تعلیم سے پوری طرح متاثر کرے جس کی زبان میں وہ اسے پیش کر رہا ہے، پھر وہی قوم دوسری قوموں تک اس تعلیم کے پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ یہی ایک فطری طریقہ ہے کسی دعوت و تحریک کے بین الاقوامی پیمانے پر پھیلنے کا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اس سورہ کے دیباچہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کفار مکہ میں سے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے، بلکہ اپنے نزدیک آپ کا بھرم کھولنے کے لیے، غالباً یہودیوں کے اشارے پر، آپ کے سامنے اچانک یہ سوال پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے مصر پہنچنے کا کیا سبب ہوا۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ باب پیش کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر یہ فقرہ ارشاد ہوا ہے کہ اے محمد! تم ان واقعات سے بے خبر تھے، دراصل یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعہ سے تمہیں ان کی خبر دے رہے ہیں۔ بظاہر اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اصل میں روئے سخن ان مخالفین کی طرف ہے جن کو یقین نہ تھا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

[۲] اس سے مراد حضرت یوسف کے وہ دس بھائی ہیں جو دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوب کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسف سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انہیں کچھ تامل ہو، اس لیے انہوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب تھا کہ سورج سے مراد حضرت یعقوب، چاند سے مراد ان کی بیوی (حضرت یوسف کی سوتیلی والدہ) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں۔

کرے گا[۱] اور تجھے باتوں کی تہ کو پہنچنا سکھائے گا[۲] اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کریگا
٤ جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے دادا اور پردادا ابراہیم اور اسحٰق پر کرچکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔[۳]
حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔
جب انھوں نے آپس میں کہا کہ "یہ یوسف اور اس کا بھائی[۴] دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں

---

[۱] یعنی نبوت عطا کرے گا۔

[۲] "تَاوِیْلِ الْاَحَادِیْث" کا مطلب محض تعبیر خواب کا علم نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تو ہر معاملہ کی گہرائی میں اترنے اور اس کی تہ کو پالینے کے قابل ہو جائے گا۔

[۳] قرآن مجید کا یہ بیان بائیبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ اُن کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت یعقوب کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے نہ کہ توراۃ و تلمود کا۔ حضرت یوسف نے خواب بیان کیا تھا، کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس کی جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب ہی سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر برا مانے اور خواب دیکھنے والے کو الٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے آئندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے الٹا جل بھن جائے؟

[۴] اس سے مراد حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمین ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوب ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت ممدوح کی ساری اولاد میں صرف ایک یوسفؑ ہی ایسے تھے جن کے اندر آپ کو آثار رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اور پھر حضرت یوسف کا خواب سن کر حضرت یعقوب نے

(باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں، صاف نظر آتا ہے کہ ابا جان بہک گئے ہیں۔[۵] چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے، یہ کام ہو جانے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔[۶] ان میں سے ایک نے کہا "یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو، کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔" اس قرارداد پر انھوں نے جا کر اپنے باپ سے کہا "ابا جان، کیا بات ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادران یوسف کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے الٹا الزام حضرت یوسف پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کوئی منظم ریاست موجود نہیں ہوتی اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں، وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے کتنے ہیں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت، فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں کام آ سکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بھائیوں نے کہا کہ ہمارے والد بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں، ہم جوان بیٹوں کا جتھا، جو برے وقت ان کے کام آ سکتا ہے، ان کو اتنا عزیز نہیں جتنے یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ان کے کسی کام نہیں آ سکتے بلکہ اُنہی خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

[۶] یہ فقرہ ان لوگوں کے نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو خواہشات نفس کے حوالے کر دینے کے ساتھ ایمان اور نیکی سے بھی کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نفس ان سے کسی برے کام کا تقاضا کرتا ہے تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے اس کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسے مواقع پر اپنے نیم جان ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دیدیا کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر، یہ ناگزیر گناہ، جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے، کر گزرنے دے، پھر انشاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیرخواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے، کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔"[1] باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے کوئی بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو۔" انھوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھا لیا، جبکہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے۔" اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے اس فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔"[2] شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا

[1] یہ بیان بھی بائیبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سِکم کی طرف گئے ہوئے تھے اور بعد میں حضرت یعقوب نے خود ان کی تلاش میں حضرت یوسف کو بھیجا تھا۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے حسد کا حال جانتے کے باوجود انھیں آپ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بھیجا ہو۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

[2] متن میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر کیا وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کی یہ حرکت انھیں جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انھیں وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائیبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو ایک جلیل القدر منصب کے لیے نامزد ہو چکا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا

(باقی صفحہ ۱۹۰ پر)

اُگر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں"۔ اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا، اور بخوبی کروں گا جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقے نے جو کنوئیں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ) وہ پکار اٹھا "مبارک ہو، یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے؟ ۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنوئیں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا اس موقع پر کرے گا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] متن میں "صبرِ جمیل" کے الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ "اچھا صبر" ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، جزع فزع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آ پڑی ہو۔

[2] بائیبل اور تلمود بیان حضرت یعقوب کے تاثر کا نقشہ بھی ایسے انداز سے کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائیبل کا بیان یہ ہے کہ "تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا"۔ اور تلمود کا بیان ہے کہ "یعقوب بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے ..... اور وہ سالہا سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا"۔ اس نقشے میں حضرت یعقوب وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس میں ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھی بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے، اور پھر عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر بھی کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ بھی کرتا ہے۔ (حاشیہ ۳ صفحہ ۲۰ پر)

مصر میں جس شخص نے اسے خریدا[۵۵] اس نے اپنی بیوی[۵۶] سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا۔ بعید نہیں کہ یہ ہمارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) [۵۴] اس سے معاملہ کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسف کو کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے، بعد میں قافلے والوں نے ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائیبل کا بیان ہے کہ برادران یوسف نے بعد میں اسماعیلیوں کے ایک قافلے کو دیکھا اور چاہا کہ یوسف کو کنویں سے نکال کر ان کے ہاتھ بیچ دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی مدین کے سوداگر انھیں کنویں سے نکال چکے تھے، ان سوداگروں نے حضرت یوسف کو بیس روپے میں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر آگے چل کر بائیبل کے مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر وہ اسماعیلیوں کے ہاتھ حضرت یوسف کو فروخت کرا چکے ہیں، چنانچہ وہ اسماعیلیوں کے بجائے پھر مدین ہی کے سوداگروں سے مصر میں انھیں دوبارہ فروخت کراتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۳۷۔ آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶)۔ اس کے برعکس تلمود کا بیان یہ ہے کہ مدین کے سوداگروں نے یوسف کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا، پھر برادران یوسف نے حضرت یوسف کو ان کے قبضہ میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا، آخر کار انھوں نے ۲۰ درہم قیمت ادا کر کے برادران یوسف کو راضی کیا۔ پھر انھوں نے بیس ہی درہم میں انھیں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر انھیں فروخت کیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادران یوسف نے حضرت یوسف کو فروخت کیا تھا۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اس روایت کی تائید نہیں کرتا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۵] بائیبل میں اس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ قرآن مجید آگے چل کر اسے "عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور پھر ایک دوسرے موقع پر یہی لقب حضرت یوسف کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بہت بڑا عہدہ دار یا صاحب منصب تھا، کیونکہ "عزیز" کے معنی ایسے با اقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جا سکتی ہو۔ بائیبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا، اور ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہی خزانے کا افسر تھا۔

[۵۶] تلمود میں اس عورت کا نام زَلیخا (Zelicha) لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا ہے۔ مگر یہ بات بالکل بے اصل ہے کہ بعد میں حضرت یوسف سے اس عورت کا نکاح ہوا۔ اس کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ اسرائیلی تواریخ میں۔ اور ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اس کو ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔

لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۱؎۔" اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۲؎۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔

۱؎ تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر ۱۸ سال کی تھی اور فوطیفار ان کی شاندار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ جب وہ انھیں خرید رہا تھا اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ غلام تو نہیں معلوم ہوتا، مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چُرا لائے ہو۔ اسی بنا پر فوطیفار نے ان سے غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے گھر اور اپنی کل املاک کا مختار بنا دیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ "اس نے اپنا سب کچھ یوسف کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سوا روٹی کے جسے وہ کھا لیتا تھا اسے اپنی کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔" (پیدائش ۳۹-۶)

۲؎ حضرت یوسف کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم ریاست تھی اور نہ تمدن و تہذیب نے کوئی بڑی ترقی کی تھی۔ کچھ آزاد قبائل تھے جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے، اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بنا لی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے پہلو میں قریب قریب وہی تھا جو آج کل ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر آزاد علاقہ کے قبائل کا ہے۔ یہاں حضرت یوسف کو جو تعلیم و تربیت ملی تھی اس میں بدویانہ زندگی کے محاسن اور خانوادۂ ابراہیمی کی خدا پرستی و دینداری کے عناصر تو ضرور شامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ اس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک، یعنی مصر میں ان سے جو کام لینا چاہتا تھا، اور اس کے لیے جس واقفیت، جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی اس کے نشوونما کا کوئی موقع بدوی زندگی میں نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انھیں سلطنت مصر کے ایک بڑے عہدے دار کے ہاں پہنچا دیا اور اس نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں اپنے گھر اور اپنی جاگیر کا مختارِ کل بنا دیا۔ اس طرح یہ موقع پیدا ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں جو اب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں، اور انھیں ایک چھوٹی جاگیر کے انتظام سے وہ تجربہ حاصل ہو جائے جو آئندہ ایک بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانے کے لیے درکار تھا۔ اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا[1]، اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اُس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آجا"۔ یوسفؑ نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں !) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"[2]۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی

[1] قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم "نبوت عطا کرنا" ہوتا ہے۔ "حکم" کے معنی قوتِ فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی عطا کی اور اختیارات بھی تفویض فرمائے۔ رہا "علم" تو اس سے مراد وہ خاص علم حقیقت ہے جو انبیاء کو وحی کے ذریعہ سے براہِ راست دیا جاتا ہے۔

[2] عام طور پر مفسرین اور مترجمین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں میرے رب کا لفظ حضرت یوسفؑ نے اُس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جس کی ملازمت میں وہ اُس وقت تھے اور ان کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میرے آقا نے تو مجھے ایسی اچھی طرح رکھا ہے، پھر میں یہ نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے زنا کروں۔ لیکن مجھے اس ترجمہ و تفسیر سے سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عربی میں لفظ رب "آقا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ بات ایک نبی کی شان سے بہت گری ہوئی ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔ اور قرآن میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ کسی نبی نے خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب کہا ہو۔ آگے چل کر خود اسی سورہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے اور مصریوں کے مسلک کا یہ فرق بار بار واضح فرماتے ہیں کہ ان کا رب تو اللہ ہے اور مصریوں نے بندوں کو اپنا رب بنا رکھا ہے۔ پھر جب آیت کے الفاظ میں یہ مطلب لینے کی بھی گنجائش موجود ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ربی کہہ کر اللہ کی ذات مراد لی ہو، تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک ایسے معنی کو اختیار کریں جس میں صریحاً قباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

دلیل نہ دیکھ لیتا۔[۵۱] ایسا ہوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں،[۵۲] درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخرکار یوسف اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا

۵۱ رب کی دلیل سے مراد وہی بات ہے جو اوپر حضرت یوسف نے اس عورت کی دعوتِ عیش کے جواب میں فرمائی تھی کہ "میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی۔" یہی وہ برہانِ رب تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ "یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا" تو اس سے عصمتِ انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش و خطا کی استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود، اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے دل و دماغ پر اپنے رب کی برہان کا ایسا تسلط رکھتا ہے کہ خواہشِ نفس کبھی اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرماتا ہے، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری امت کی لغزش ہے۔ وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

۵۲ اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا دلیلِ رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق و ہدایت سے ہوا کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسف کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلہ میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو بدی اور بے حیائی سے پاک کرنے اور ان کی طہارتِ نفس کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے مصلحتِ الٰہی میں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟ یوسف نے کہا یہی مجھے پھسلا رہی تھی حالانکہ میں راضی نہ تھا۔ اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا، اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔" جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری طاقت پرہیزگاری و تقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دے دیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ اس سے معاملہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صاحب خانہ کے ساتھ خود اس عورت کے بھائی بندوں میں سے بھی کوئی شخص آرہا ہوگا اور اس نے یہ قضیہ سن کر کہا ہوگا کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت سے اس معاملہ کی یوں تحقیق کی جا سکتی ہے۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہادت پیش کرنے والا ایک شیر خوار بچہ تھا جو وہاں پنگھوڑے میں لیٹا ہوا تھا اور خدا نے اسے گویائی عطا کر کے اس سے یہ شہادت دلوائی۔ لیکن یہ روایت نہ تو کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور نہ اس معاملے میں خواہ مخواہ معجزے سے مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اس شاہد نے قرینے کی جس شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ سراسر ایک معقول شہادت ہے اور اس کو دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک معاملہ فہم اور جہاندیدہ آدمی تھا جو صورت معاملہ کے سامنے آتے ہی اس کی تہ کو پہنچ گیا۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف کا قمیص سامنے سے پھٹا ہو تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ اقدام یوسف کی جانب سے تھا اور عورت اپنے آپ کو بچانے کی کشمکش کر رہی تھی۔ لیکن اگر یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عورت اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور یوسف اس سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ قرینے کی ایک اور شہادت بھی اس شہادت میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ اس شاہد نے توجہ صرف یوسف علیہ السلام کے قمیص کی طرف دلائی۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورت کے جسم یا اس کے لباس پر تشدد کی کوئی علامت سرے سے پائی ہی نہ جاتی تھی، حالانکہ اگر یہ مقدمہ اقدام زنا بالجبر کا ہوتا تو عورت پر اس کے کھلے آثار پائے جاتے۔

بائیبل اس اہم مضمون سے خالی ہے۔ البتہ تلمود کا بیان قرآن کے بیان سے بڑی حد تک متفق ہے۔
(باقی صفحہ ۲۲ پر)

واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں۔ یوسف! اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطا کار تھی۔"؎۲ ع۳

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔" اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی؎۱ اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھ دی (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔ اور بے ساختہ پکار اٹھیں "حاشا للہ، یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔" عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا۔"؎۲ یوسف نے کہا "میرے رب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ تصفیہ وہیں دروازے ہی پر چاپ کیا تھا اور عزیز مصر نے اپنی بیوی کو قصوروار پاکر اسے یوسف علیہ السلام سے معافی مانگنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن تلمود کی روایت یہ ہے کہ عزیز نے اپنی بیوی کی شکایت سن کر پہلے تو حضرت یوسف کو خوب پٹوایا، پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا، اور حکام عدالت نے حضرت یوسف کے قمیص کا جائزہ لے کر فیصلہ دیا کہ قصور عورت کا ہے۔ اب ہر شخص تھوڑے سے غور و تامل سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں سے کونسی روایت زیادہ معقول اور قرین قیاس ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے ایک ذی وجاہت آدمی نے ایسے نازک معاملہ کو جو اس کی آبرو سے تعلق رکھتا تھا، عدالت میں پیش کرنا پسند کیا ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎۱ یعنی ایسی مجلس جس میں مہمانوں کے لیے تکیے لگے ہوئے تھے۔ مصر کے آثار قدیمہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں تکیوں کا استعمال بہت ہوتا تھا۔

بائیبل میں اس ضیافت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر وہ قرآن سے بہت مختلف ہے۔ قرآن کے بیان میں جو زندگی، جو روح، جو فطریت اور جو اخلاقیت پائی جاتی ہے اس سے تلمود کا بیان بالکل خالی ہے۔

؎۲ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے

قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔[۵۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) جن عورتوں کو بلایا ہوگا وہ امراء و رؤساء اور بڑے عہدہ داروں کے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی۔ ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوبصورت جوانی دکھا کر انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوان رعنا پر اگر میں مرمٹی تو آخر اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو بیگم عزیز نے کیا۔ پھر شریف خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو علانیہ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر میرا یہ غلام میرے ساتھ زنا کرنے پر راضی نہ ہوا تو میں اسے قید کرا دوں گی۔ یہ سب کچھ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یورپ اور امریکہ آج عورتوں کی جس آزادی و بے باکی کو بیسویں صدی کی ترقیات کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بہت پرانی چیز ہے، دقیانوس سے بھی سینکڑوں برس پہلے مصر میں یہ اسی شان کے ساتھ پائی جاتی تھی جیسی آج اس "روشن زمانے" میں پائی جا رہی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۱] یہ آیات ہمارے سامنے ان حالات کا ایک عجیب نقشہ پیش کرتی ہیں جن میں اس وقت حضرت یوسف مبتلا تھے۔ انیس بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو بدویانہ زندگی سے بہترین تندرستی اور بھری جوانی لیے ہوئے آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور جبری غلامی کے مراحل سے گزرنے کے بعد قسمت اسے دنیا کی سب سے بڑی متمدن سلطنت کے پایۂ تخت میں ایک بڑے رئیس کے ہاں لے آئی ہے۔ یہاں پہلے تو خود اس گھر کی بیگم ہی اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے جس سے اس کا شب و روز کا سابقہ ہے۔ پھر اس کے حسن کا چرچا سارے دارالسلطنت میں پھیلتا ہے اور شہر بھر کے امیر گھرانوں کی عورتیں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف سینکڑوں خوبصورت جال ہیں جو ہر وقت ہر جگہ اسے پھانسنے کے لیے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی تدبیریں اس کے جذبات کو بھڑکانے اور اس کے زہد کو توڑنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ جدھر جاتا ہے یہی دیکھتا ہے کہ گناہ اپنی ساری خوشنمائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا ہے۔ کوئی تو فجور کے مواقع خود ڈھونڈھتا ہے، مگر یہاں مواقع خود اس کو ڈھونڈ رہے ہیں اور اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ جس وقت بھی اس کے دل میں برائی کی طرف ادنیٰ میلان پیدا ہو وہ فوراً اپنے آپ کو اس کے (باقی صفحہ ۲۰ پر)

اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کردیں۔[1] بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کردیں حالانکہ وہ (اس کی پاکدامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[2] ع۴

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) سامنے پیش کردیں۔ رات دن کے چوبیں گھنٹے وہ اس خطرے میں بسر کر رہا ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ارادے کی بندش میں کچھ ڈھیل آجائے تو وہ گناہ کے ان بے شمار دروازوں میں سے کسی میں داخل ہوسکتا ہے جو اس کے انتظار میں کھلے ہوئے ہیں۔ اس نگری کا حال یہ ہے کہ:

شہریست پر ز خوباں وز ہر طرف نگارے ۔۔۔ یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

اس حالت میں یہ خدا پرست نوجوان جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتا ہے وہ بجائے خود کچھ کم قابل تعریف نہیں ہے، مگر ضبط نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عرفانِ نفس اور طہارتِ فکر کا مزید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی اس کے دل میں کبھی یہ متکبرانہ خیال نہیں آتا کہ واہ رے میں، کیسی مضبوط ہے میری سیرت کہ ایسی ایسی حسین اور جوان عورتیں میری گرویدہ ہیں اور پھر بھی میرے قدم نہیں پھسلتے۔ اس کے بجائے وہ اپنی بشری کمزوریوں کا خیال کرکے کانپ اٹھتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کرتا ہے کہ اے رب، میں ایک کمزور انسان ہوں، میرا اتنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کرسکوں، تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا، ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں ــــ درحقیقت یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ دیانت، امانت، عفت، حق شناسی، راست روی، انضباط، اور توازن ذہنی کی غیر معمولی صفات جو اب تک ان کے اندر چھپی ہوئی تھیں اور جن سے وہ خود بھی بے خبر تھے، وہ سب کی سب اس شدید آزمائش کے دور میں ابھر آئیں، پورے زور کے ساتھ کام کرنے لگیں، اور انھیں خود بھی معلوم ہوگیا کہ ان کے اندر کون سی قوتیں موجود ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے سکتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] دفع کرنا اس معنی میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کی سیرت صالحہ کو ایسی مضبوطی بخش دی گئی جس کے مقابلہ میں ان عورتوں کی ساری تدبیریں ناکام ہوکر رہ گئیں۔

[2] اس طرح حضرت یوسف کا قید میں ڈالا جانا درحقیقت ان کی اخلاقی فتح اور مصر کے پورے طبقۂ امراء

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

قید خانہ میں دو غلام[1] اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے[2]۔ ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں"۔ دوسرے نے کہا "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں[3]"۔ یوسف نے کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) حکام کی اخلاقی شکست کا اتمام و اعلان تھا۔ اب حضرت یوسف کوئی غیر معروف اور گمنام آدمی نہ رہے تھے بلکہ ہیں، اور کم از کم دار السلطنت میں تو عام و خاص سب ان سے واقف ہو چکے تھے۔ جس شخص کی دل فریب شخصیت پر ایک دو نہیں، اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی خواتین فریفتہ ہوں، اور جس کے فتنۂ روزگار حسن سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی ہو کہ اسے قید کر دیں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ضرور ہے کہ گھر گھر اس کا چرچا پھیل گیا ہو اور عام طور پر سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ یہ شخص کیسے بلند اور مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے اور یہ بھی کہ اسے جیل اپنے کسی جرم پر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ مصر کے امرا اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنے کے بجائے اس بے گناہ کو جیل بھیج دینا زیادہ آسان پاتے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] غالباً اس وقت جبکہ حضرت یوسف قید کیے گئے ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے نکل کر جب وہ مصر کے فرمانروا بنائے گئے تو ان کی عمر تیس سال کی تھی، اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں وہ بِضع سنین یعنی کئی سال رہے۔ بضع کا اطلاق عربی زبان میں دس تک کے عدد کے لیے ہوتا ہے۔

[2] یہ دو غلام جو قید خانہ میں حضرت یوسف کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان کے متعلق بائیبل کی روایت ہے کہ ان میں سے ایک شاہِ مصر کے ساقیوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی نان بائیوں کا افسر۔ تلمود کا بیان ہے کہ ان دونوں کو شاہ مصر نے اس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے ایک گلاس میں مکھی نکل آئی تھی۔

[3] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسف کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اوپر جن واقعات کا ذکر گزر چکا ہے ان کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات قابل تعجب نہیں رہتی کہ ان دو قیدیوں نے آخر حضرت یوسف ہی سے اگر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی اور ان کی خدمت میں یہ نذر عقیدت کیوں پیش کی کہ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

"یہاں جو کھانا تمھیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق، اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کے اختیارات اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اے زنداں کے ساتھیو! تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر) کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے۔"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس آدمی ہے۔ سخت ترین آزمائشوں میں وہ اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے کر آئے تھے۔ مصر کا بچہ بچہ جان چکا تھا کہ آج پورے ملک میں ان سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے حتیٰ کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں بھی ان کی نظیر مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ خود قید خانے کے حکام اور اہل کار بھی ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ چنانچہ بائیبل میں ہے کہ "قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسف کے ہاتھ میں سونپا اور جو کچھ وہ کرتے اسی کے حکم سے کرتے تھے، اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے بے فکر تھا" (پیدائش ۳۹: ۲۲، ۲۳)

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] یہ تقریر جو اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے، بائیبل اور تلمود میں کہیں اس کی طرف ادنیٰ اشارہ تک نہیں ہے۔ وہ حضرت یوسف کو محض ایک دانشمند اور پرہیزگار آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ مگر قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی سیرت کے ان پہلوؤں کو بھی بائیبل اور تلمود کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن کر کے پیش کرتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنا ایک پیغمبرانہ مشن رکھتے تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ کا کام انھوں نے قید خانہ ہی میں شروع کر دیا تھا۔

یہ تقریر ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یونہی سرسری طور پر گزر جائیے۔ اس کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) یہ پہلا موقع ہے جبکہ حضرت یوسفؑ دینِ حق کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی داستانِ حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں صرف اخلاقِ فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مرحلوں پر ابھرتی رہی ہیں تبلیغ کا کوئی نشان وہاں نہیں پایا جاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مراحل محض تیاری اور تربیت کے تھے۔ نبوت کا کام عملاً اب اس قید خانے کے مرحلے میں ان کے سپرد کیا گیا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریرِ دعوت ہے۔

(۲) یہ بھی پہلا ہی موقع ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی۔ اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی۔ جب قافلے نے ان کو پکڑ کر غلام بنایا، جب وہ مصر میں لائے گئے، جب انھیں عزیزِ مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا، جب انھیں جیل بھیجا گیا، ان میں سے کسی موقع پر بھی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کا پوتا اور یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ دادا کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے خواہ اہلِ مدین تھے یا اسماعیلی، دونوں ان کے ہم نسل ہی تھے۔ اہلِ مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیمؑ سے تو ناواقف نہ تھے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے کبھی باپ دادا کا نام لے کر اپنے آپ کو اُن حالات سے نکالنے کی کوشش نہ کی جن میں وہ پچھلے چار پانچ سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انھیں بنانا چاہتا ہے اس کے لیے اُن کا ان حالات سے گزرنا ہی ضروری ہے۔ مگر اب انھوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوتِ توحید کی اُس عالمگیر تحریک سے ہے جس کے ائمہ ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعیِ حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سوجھی تھی، بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں اس ازلی و ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔

(۳) پھر حضرت یوسف نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا اس میں ہم کو حکمت تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ ان کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا۔ مگر جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے بےڈھنگے پن اور جھگڑالو پن سے انہیں الٹا متنفر کرکے چھوڑتا ہے۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسف چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطۂ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہوگی کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آجاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو، اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا"۔ مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا۔[۱] ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) کے ہر شائبے کے بغیر، بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم اَن داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب محض خالی خولی نام ہی ہیں، ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی و مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو، ان میں سے کسی کے لیے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرمانروائی کے سارے اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(۵) اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف نے قید خانے کی زندگی کے یہ آٹھ دس سال کس طرح گذارے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چونکہ ان کے ایک ہی وعظ کا ذکر ہے اس لیے انھوں نے صرف ایک ہی دفعہ دعوت دین کے لیے زبان کھولی ہوگی۔ مگر اول تو ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان کرنا ہی سخت بدگمانی ہے کہ وہ اپنے اصل کام سے غافل ہوگا۔ پھر جس شخص کی تبلیغی دھن کا حال یہ تھا کہ دو آدمی تعبیر خواب پوچھتے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تبلیغ شروع کر دیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے قید خانے کے یہ چند سال خاموش ہی گذار دیے ہوں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] اس مقام کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ "شیطان نے حضرت یوسف کو اپنے رب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی یاد سے غافل کر دیا اور انھوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ اپنے رب (یعنی شاہ مصر) سے ان کا تذکرہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں پڑے رہے"۔ درحقیقت یہ تفسیر بالکل غلط ہے۔ صحیح یہی ہے، جیسا کہ علامہ ابن کثیر، اور متقدمین میں سے مجاہد اور محمد ابن اسحاق وغیرہ نے کہا کہ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کی ضمیر اس شخص کی طرف پھرتی ہے جس کے متعلق حضرت یوسف کا گمان تھا کہ وہ رہائی پانے والا ہے، اور اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ "شیطان نے اسے اپنے آقا سے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا"۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر یوسف علیہ السلام نے وہ بات نہ کہی ہوتی جو انھوں نے کہی تو وہ قید میں کئی سال نہ پڑے رہتے"۔ لیکن علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جتنے طریقوں سے روایت کی گئی ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ بعض طریقوں سے یہ مرفوعاً روایت کی گئی ہے اور ان میں سفیان بن وکیع اور ابراہیم بن یزید راوی ہیں جو دونوں ناقابل اعتماد ہیں۔ اور بعض طریقوں سے یہ مرسلاً روایت ہوئی ہے اور ایسے معاملات میں مرسلات کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ بریں درایت کے اعتبار سے بھی یہ بات باور کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ایک مظلوم شخص کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدبیر کرنا خدا سے غفلت اور توکل کے فقدان کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

مقالات

اساس دین کی تعمیر

(۲)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

(۲) ایمان بالآخرت اس بنیاد کا دوسرا پتھر ایمان بالآخرت ہے، یعنی ایک ایسے روز جزا کے آنے پر کامل یقین جس میں اعمال انسانی کا خالص اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے گا، اور جب اللہ تعالےٰ کا دست عدل وحکمت آگے بڑھے گا اور بڑھ کر ہمارے شعور وکردار کے چہرہ سے اس دارالعمل میں کام کرنے والے قوانین طبعی کی نقاب الٹ دے گا۔ جس کے بعد ہر نفس مجبور ہوگا کہ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے اس کے اخلاقی نتائج سے دوچار ہو۔

ایمان بالآخرت کی اصل وحقیقت یہ بات، کہ ایک یوم جزا آنے والا ہے، قرآن میں جس اہتمام سے بیان ہوئی ہے اس کو دیکھ کر عام ذہن تو یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ بھی ایمان باللہ کی طرح اپنی ایک مستقل اصل اور حیثیت رکھتی ہے۔ مگر فی الواقع یہ اسی ایمان باللہ کی ایک فرع ہے، یا یوں کہئیے کہ اس کا ایک قریب ترین مقدمنا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایمان باللہ کے معنی ہیں ذات خداوندی اور صفات باری تعالےٰ کا ٹھیک ٹھیک تصور اور اذعان۔ ان صفات میں جو صفتیں نمایاں ترین ہیں اور جن کے جلوے ہر سمت چھائے نظر آتے ہیں۔ ان میں عدل، حکمت اور رحمت کی صفات بھی ہیں۔ یہ تینوں صفات چاہتی ہیں اور اپنا پہلا مطالبہ ہی یہی پیش کرتی ہیں کہ ایک نہ ایک دن جزا وسزا کی میزان آویزاں کی جائے، ورنہ یہ صفات ناقص، اور کمال سے عاری قرار پاتی ہیں، اور ناقص اور کمال سے عاری صفات ذات الٰہی سے اس وقت تک منسوب نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ وجوب و امکان کے معنے ایک نہ سمجھ لئے جائیں اور خالق کو مخلوقات کی صف میں نہ لاکھڑا کیا جائے۔ رہا یہ سوال، کہ یہ صفتیں ایک یوم جزا کے آنے کو کیونکر مستلزم اور متقاضی ہیں، تو یہ اپنے جواب کے لئے غور وبحث کی ایک طولانی تفصیل

چاہتا ہے، جس کا یہ موقع نہیں، اس لئے یہاں صرف چند سرسری اشارات پر ہی اکتفا کیا جائے گا:۔

اقتضائے عدل عدل کے معنی ہیں کانٹے کی تول حق رسانی، یعنی جو شخص جس حق اور جس برتاؤ کا مستحق ہو وہ ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ عادل ہے تو اس کا مجرد عادل ہونا ہی تقاضا کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے۔ اس نے جو اخلاقی حدود مقرر کیئے ہیں ان کی پابندی کرنے والے کو اپنی خوشنودیوں اور نعمتوں سے شادکام کرے اور جو ان حدود کا پاس نہ کرے اس کو قرار واقعی سزا دے۔ عدل وانصاف کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے آج تک اختلاف ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا میں کسی نے بھی دوست اور دشمن، فرمانبردار اور نافرمان، اطاعت کیش اور باغی دونوں کو ایک برتاؤ کا اہل نہیں سمجھا ہے، تو یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذات جو سراپا عدل وانصاف ہے، وہ اپنے وفاداروں اور باغیوں میں تمیز نہ کرے گی! چنانچہ اس نے خود ان لوگوں سے جو اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنے اعمال بد کے انجام سے بے فکر تھے، حیرت بھرے انداز میں پوچھا اور بار بار پوچھتا رہا کہ نادانو! جب یہ ایک حقیقت ہے کہ اندھا آنکھوں والے کے، تاریکی روشنی کے، سایہ دھوپ کے اور مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ (وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ)۔ اور تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تو پھر تمہارے دماغ میں، بقائمی ہوش و حواس، اتنی بڑی بے عقلی کی بات کیونکر سما جاتی ہے کہ ہم مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے؟ (أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟)۔

غرض نیکو کاروں کو اچھا اور بدکاروں کو برا بدلہ ملنا، اور ان کے اعمال کے عین مطابق ملنا عدل خداوندی کا سب سے بڑا اور لازمی تقاضا ہے۔ مگر اس دنیا میں عملاً ہو کیا رہا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ یہاں کی خوش حالیاں، یہاں کی زینتیں، یہاں کی نعمتیں یہاں کی سربلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جو اہل حق ہیں، بلکہ اُلٹی ان کے حصہ میں آتی ہیں جو حق کے دشمن اور احکام الٰہی کی دھجیاں اڑانے والے ہیں؟۔ اسی طرح کیا وہ جو ان احکام کی پیروی کرتے ہیں ان کے گرد و پیش بدحالیاں، گمنامیاں، فلاکتیں مظلومیتیں نہیں چھائی رہتی ہیں؟ کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ بدی، ظلم، کیادی اور بے ایمانی کی راہ دولت و عزت کے عشرت کدوں میں لے جاتی ہے اور نیک روی، حسن خلق، حق شناسی

اور خدا پرستی کا راستہ ان خارزاروں میں پہنچا دیا کرتا ہے جہاں دل شکنیوں، مشکلوں اور مصیبتوں کے کانٹے انسان کے جسم و روح کو چھلنی بنا دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں نت اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔ تو اگر کوئی دوسرا عالم برپا ہو اور کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اس صورت حال کو پلٹ دیا جائے اور ہر شخص کا حساب اس کے اعمال کے صحیح استحقاق کے مطابق چکا دیا جائے تو خدا کا وہ عدل کہاں رہا جو اس کی بدیہی صفات کمال میں سے ہے! اس لیے اگر خدا عادل ہے تو ایک یوم الحساب کا آنا اس کے عدل کا ویسا ہی لازمہ ہے جیسا کہ عدل اس کی خدائی کا۔

اقتضائے حکمت اب صفتِ[۲] حکمت کو لیجیے۔ حکیم کہتے ہی اس کو ہیں جس کا کوئی فعل حکمت اور مقصدیت سے خالی نہ ہو۔ جو جتنا بڑا حکیم ہوگا۔ اس کے افعال اتنے ہی زیادہ بامقصد اور پُر از حکمت ہوں گے۔ یہ ایک عام مسئلہ ہے، اور علم منطق کے ابتدائی بدیہیات میں سے ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں اس حکیم و دانائے مطلق کے افعال و شئون پر نگاہ ڈالیے جو سراپا حکمت اور منبع حکمت ہے۔ یہ کارگاہِ عالم، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے اور آپ کی حدود نظر میں ہے، اسی حکیم کے کارناموں کا ایک باب ہے۔ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہ عظیم الشان کائنات، جس کے تمام اجزا منظم طور پر سعی و حرکت میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مختلف حصوں میں کامل توافق اور ہم آہنگی نظر آ رہی ہے، جس کا ایک ایک ورق علت و معلول کے ناقابل شکست شیرازہ میں بندھا ہوا ہے، کیا یہ کائنات اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی غایت نہیں رکھتی؟ جس کائنات کا ہر جزو اپنی جگہ نہایت کھلے ہوئے مقاصد کا حامل ہے، کیا وہ بحیثیت مجموعی اپنا کوئی ایک مقصد بھی نہیں رکھتی؟ یعنی کُل کا ہر جزو تو بجائے خود بامقصد ہو، مگر کُل بحیثیت کُل بے مقصد ہو! عقل سلیم اسے کیسے مان سکتی ہے؟ اور پھر یہ انسان جس کو عقل و فکر کی بے نظیر صلاحیتیں اور سعی و عمل کی حدود نا آشنا قابلیتیں دے کر بھیجا گیا ہے، کیا اس کی آفرینش مقصدیت سے تہی دامن ہو سکتی ہے؟ جس انسان کی چاکری میں زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے آفتاب و ماہتاب تک لگے ہوئے ہوں وہ خود کسی غایت و مقصد کی غلامی سے آزاد ہے؟ خالق کائنات کو حکیم ماننے والا اس سوال کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی بصیرت کی نگاہیں تو جب ان حقائق کو دیکھیں گی تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھے گا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور وہ جب بھی خدا کی صفت حکمت کا تصور کرے گا اس کی زبان زبانِ الٰہی سے ہم نوا ہو کر

باندازِ استعجاب دنیا سے سوال کرے گی کہ :

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (قیامہ-۲)
کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائیگا؟

اور یہ کہ :-

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ - (مومنون — ۶)
کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بلا کسی مقصد کے پیدا کئے گئے ہو اور تمہیں اپنے خالق کے روبرو لوٹ کر جانا نہیں ہے؟

اقتضائے رحمت | اسی صفتِ رحمت، تو اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ایک یوم مکافات برپا ہو، تاکہ ان بندگانِ حق کی سعی و جہد کا، جو دنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوئے خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے رنج و غم کے غبار کو جھاڑ دے جس طرح ایک ماں اپنے نوبائے ارادہ نُولے بچے کی بلائیں لے کر اس کو دلشاد کرتی ہے جب کہ وہ اس کے حکم کے بموجب کسی کٹھن مہم میں اپنے پسینے بہاکر واپس آیا ہو۔ ورنہ خدا کا رحیم ہونا تو درکنار، اس کو بے مروتی اور سنگ دلی سے بری ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ تعالی اللہ عنہ۔ پس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر کہ ایک یوم ہو کر رہے گا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود قرآن کے اشارات میں واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ - (انعام — ۲)
اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے (اس لئے) وہ قیامت کے دن تم سب کو ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

ایمان بالآخرت کی اہمیت | اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان بالآخرت کی اصل و حقیقت کا تعلق ہے وہ فی الواقع ایمان باللہ ہی کی فرع ہے اور اس لئے اس کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہے، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے آشکارا ہو چکا، مگر دینِ حق کی اطاعت و اقامت کے زاویۂ نظر سے، اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظ سے یہ اس کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا مالک نہیں، بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر ہے انسان کی حیوانی جبلت میں جو عجلت پسندی و نفع طلبی، عاجلہ پرستی ودیعت کی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جاسکتا کہ اگر انسان کو اپنے اعمال کی باز پرس کا اندیشہ نہ ہو تو وہ نیکی و حق پرستی کی سنگلاخ وادی

قطع کرنے پر تیار ہوگا۔ اس کو خدا کی ذات اور اس کی یکتائی کا لاکھ یقین ہی، مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری اور قطعی انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جانے والا ہے، تو نرا نادان ہی ہوگا اگر اس نے "بعیش کوش" کے فتوے پر عمل نہ کیا، اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی کرے گی اگر اس نے جی کھول کر داد نفسانیت نہ دی[1]۔ بخلاف اس کے اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب لیئے جانے کا پورا یقین ہو تو بہر حال اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا، نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں،

---

[1] بعض صوفیہ کا یہ کہنا کہ "جس نے قیامت کے اندیشے اور عذاب دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے حق پرستی اور طاعت و بندگی کی راہ اختیار کی، اس نے فی الحقیقت شرک کیا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ جنت دوزخ سے بے نیاز ہو کر خدا کی والہانہ بندگی محض اس بنا پر کرے کہ وہی تمام صفات جمال و کمال کا جامع اور وہی حسن مجسم ہے، نہ کہ کسی خوف اور لالچ کی بنا پر" یہ دراصل عالم جذب اور جوش محبت میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ شاعرانہ غلو کار فرما ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت کی کثرت کسی خاص مقام پر پہنچ کر روح انسانی میں ایسی وارفتگی اور انجذابی کیفیت پیدا کر دے کہ اس کے احساسات پر سے اندیشہ جزا و سزا کے نقوش قریباً ناپید ہو جائیں اور صرف محبت ہی محبت کے جذبات چھائے ہوئے رہ جائیں، مگر یہ امکان کبھی بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اول روز ہی سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے اور انسان آخرت کے کھٹکے کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر ہی اس راہ دشوار پر قدم رکھ سکتا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ خدا پرستی کے آغاز میں خوف آخرت ایک اہم عنصر بلکہ شاید اصل محرک کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس محرک کے بغیر نفس انسانی بندگی کی قیود برداشت کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں آگے چل کر جب محبت کے جذبات تیز تر ہو جائیں، اس سے بے نیازی برت سکتا ہے، اگرچہ یہ بے نیازی بھی خطرات سے خالی نہیں اور واقعات بتاتے ہیں کہ کتنے ہی ارباب سلوک اسی ترنگ میں اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھے۔ اسی لئے مومن کی صفت شریعت کے مزاج شناسوں نے یہ بیان کی ہے کہ "مومن وہ ہے جو خدا کی بندگی بیک وقت خوف اور رجا اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرے، اسی نقطے سے آغاز بھی کرے اور اسی پر اس کا انجام بھی ہو" چنانچہ قرآن مجید نے جہاں سچے مومنوں اور رحمت الٰہی کے اہل ترین بندوں کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ ان کی محبت کا اصل مرکز ذات الٰہی ہے (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ)، وہاں ان کے متعلق یہ بھی کہا ہے — پورے مدح سرایانہ انداز میں کہا ہے اور ان کے کمال بندگی پر اپنی مہر رضا ثبت کرتے ہوئے کہا ہے: (باقی صفحہ ۱۹۶ پر دیکھیں)

بلکہ ـــ اگر ایسا عملاً ممکن ہو ـــ مشرک ہوتے ہوئے بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقاید خدا کے ہاں اس کے اعمال کو میزان محاسبہ میں بے وزن بنا دیں۔ لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکر قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا اور ہوائے نفس کے ہاتھوں میں بالکلیہ اپنی زمام کار سونپ دینے سے مجتنب رہنا بہرحال زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر یا بعض اعتبارات سے اس سے بڑھ کر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس شد و مد اور جس تفصیل و تصریف کے ساتھ توحید پر دلائل دیے ہیں، معاد کے وقوع پر آفاق و انفس کی محکم اور دل نشیں شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کم زور نہیں صرف کیا ہے۔ قرآن پر نگاہ ڈالیے تو صفحے کے صفحے، اور مکی سورتوں میں تو قریب قریب پوری سورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵)

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۔

(المومن ـ ۴)

اور وہ لوگ، جو راہ خدا میں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل اس اندیشے سے کانپ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ...... اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا

(الدھر ـ ۱)

(یہ ابرار اور "عباد اللہ" وہ ہیں جو) اپنی نذروں (یعنی واجبات دینی) کو پورا کرتے ہیں اور اس بڑے دن سے ڈرتے ہیں جس کی ہولناکی عام اور ہمہ گیر ہو گی ...... (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا خوف کھاتے ہیں (اور اسی لئے یہ اعمال صالحہ کرتے ہیں)

اس قسم کی آیات قرآن میں ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی۔ ان آیات میں معمولی اہل ایمان کی صفات نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ ان میں اُن ارباب ایمان کے ایمان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو معیاری مومن ہیں، جن کو " اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا " کہا گیا ہے، جن کو الابرار کے خطاب سے نوازا گیا ہے، جن کو "عباد اللہ" اور "عباد الرحمٰن" کی سند محبوبیت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ ان آیات میں کامل المعیار ایمان کا یہ نقشہ دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ آخرت پر ایمان اور یوم الحساب کا خوف اس نقشہ میں اپنا نشان کتنا نمایاں رکھتا ہے اس کو دیکھ کر کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نیکی و تقویٰ اور سچی بندگی کا حق ادا کرنے میں، (باقی صفحہ ۱۶۷ پر دیکھو)

قیامت کے پُر ہول اور وحشت ناک کوائف کے ذکر، اور اس کے وقوع کے امکان، اور اس کی ضرورت کے دلائل سے لبریز نظر آئیں گی، جو شہادت ہے اس امر کی کہ قرآن کے نزدیک عقیدۂ آخرت کا دلوں میں اذعان پیدا کرنا (توحید کے بعد) تمام حقائق دینی سے اہم تر اور مطلوب تر ہے۔ جس قرآن کے اعجاز و بلاغت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس کا کسی امر کے ساتھ یہ اعتناء کہ اپنے الفاظ کا ایک معتدبہ حصہ وہ اسی کے اثبات و استشہاد اور اسی کی تلقین و تصریف بیان کی نذر کر ڈالے، اس بات کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں اس ایک امر کی دوسرے حقائق دینی پر وہی فوقیت ہے جو فوقیت آفتاب کو اپنے گرد گھومنے والے کروں پر حاصل ہے۔ جس طرح آفتاب کا مرکز کشش ان تمام اجرام فلکی کے قیام و بقا، اور اس کا سرچشمۂ نور ان سب کی تابناکیوں کا ضامن ہے اسی طرح یہ عقیدۂ آخرت (عقیدہ توحید سے ہم دست ہو کر) ساری نیکوکاریوں کا کفیل ہے۔ اگر اس عقیدہ کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو وہ قرآن، جس نے نماز جیسی عبادت کا صرف حکم دینے پر اکتفا کر لیا اور اس کے احکام، اس کے طریق ادا اور اس کی رکعات اور ارکان وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے پر چند کلمات کہنا اور چند لمحے دینا بھی غیر ضروری سمجھا، وہ اس کے بیان کے سلسلے میں الفاظ اور اوقات کے اس بے دریغ خرچ سے ہرگز کام نہ لیتا جس کا مشاہدہ قرآن کے صفحات میں ہم کر رہے ہیں۔

ایمان بالآخرت کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث اس کو ایمان باللہ کا ایک جزو اور فرع ہونے کے باوجود اساس دین کی تعمیر میں ایک مستقل سنگ بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے، جب کہ دوسرے تمام ایمانیات کو اس مقام کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ کیونکہ یہی دو ایمانیات ایسے ہیں جن کے صحیح تحقق پر انسانی زندگی کے سنورنے اور منشائے الٰہی کے مطابق بسر ہونے کا انحصار ہے۔ یہ دراصل دو پہیئے ہیں جو اعمال انسانی کی گاڑی کو بندگیٔ الٰہ اطاعت حق کی شاہراہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیہ بھی غائب یا بیکار ہو جائے تو یہ گاڑی کبھی بھی اس راستہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) قیامت کا یقین ایک مرکزی حیثیت اور ضروری شرط کا درجہ نہیں رکھتا ہے! حد یہ ہے کہ اس مقرب ترین اور محبوب ترین بندے کی زبان سے بھی، جس کا تقرب ناقابل تصور اور جس کی محبت اور محبوبیت ماورائے تمنا ہے، اطاعت حق پر جمے رہنے اور نافرمانی رب سے مجتنب رہنے کی وجہ یہ ظاہر کرائی جا رہی ہے کہ "ایک یوم عظیم کی سزا کا خوف ہے، قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ پھر تا بدیگراں چہ رسد۔ (ص ۱۰)

پر نہیں چل سکتی۔ ایسی صورت میں یہ گاڑی شیطان کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے جو اس کو اس شاہراہ حق سے ہٹا کر شر و طغیان کی سنگلاخ وادیوں میں گھسیٹتا پھرتا اور انجام کار ہلاکت کے گہرے کھڈ میں ڈال دیتا ہے۔ یہی ہدایت اور یہی اطاعت کے لیے ان دونوں عقائد کی یہی یکسانی۔ اور باعتبار حصول مقصد ایک کی دوسرے کی طرف یہی شدت احتیاج ہے جس کے سبب قرآن حکیم نے دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا اسلوب بیان پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے توحید کی تعلیم و ہدایت اور اس کے دلائل سے گفتگو کی ہے، وہاں بالعموم قیامت کے ذکر و اثبات سے ضرور تعرض کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ اس اہتمام کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو اس کی مرغوباتِ نفس سے روک کر اطاعت الٰہی اور نیکی و تقویٰ کے تلخ نوالوں کو حلق سے نیچے اتارنے پر آمادہ کرنا نہ تو تنہا عقیدۂ توحید کے بس میں ہے اور نہ ہی عقیدۂ آخرت کے امکان میں۔ تنہا توحید اس سے مطالبہ کرے گی کہ خدا کا حق پہچانو اور اس کے احکام کی پابندی کرو، وہ جواب دے گا جب مجھے مرنے کے بعد نسیاً منسیاً ہو جانا ہے اور خدا کے سامنے نہ حاضری دینی ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے تو خواہ مخواہ طاعت و بندگی کا یہ بارِ گراں اپنی گردن پر کیوں لادے پھروں؟ اسی طرح اگر قیام قیامت کا یقین اس سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فلاں حدود کی پابندی کرو، وہ فوراً جواب دے گا کہ نیچر نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے فنا کرے گا اور وہی اس پوری کائنات کو بھی ایک روز تباہ کر کے رکھ دے گا، یہ بیچ میں "اللہ تعالیٰ" کون سی چیز ہے جس کے کچھ حدود بھی ہیں، جن کی مجھے پابندی کرنی ہے؟ یا اگر وہ وجود الٰہی کو مانتا ہوگا مگر ساتھ ہی توحید کا قائل نہ ہوگا تو یوں کہے گا کہ "خدا کا خالق کائنات ہونا برحق؛ اس کا رب اعلیٰ ہونا بھی بجا، اور قیامت کا آنا بھی یقینی، مگر یہ ارواح عظیمہ، یہ انبیاء و ملائکہ، یہ اقطاب و بزرگان دین جن کی ہم نذریں چڑھاتے ہیں، جن کے تھانوں اور مزاروں پر ہم سالانہ یا ماہانہ یا ہفتہ وار سجدے کر لیا کرتے ہیں اور جن کو خوش رکھنے کے لیے ہم کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ سب قیامت میں اعمال کی ترازو اٹھنے کب دیں گے اور ہمارے حساب کتاب کا دفتر کھلنے کیوں پائے گا۔ ان کی ایک سفارش ہماری بخشش کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے خدا کے احکام اور حدود کی بحث سے ہمیں کیا بحث!"

ایمان بالآخرت اور دنیا پرستی میں تضاد

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی قوم میں اخلاقی بگاڑ اور مادہ پرستانہ طرز عمل رونما ہوا ہے اسی وقت ہوا ہے جب کہ اس کے اندر سے توحید کا تصور اور آخرت کا خوف رخصت ہو چکا تھا،

یا اگر تھا بھی تو اتنا دھندلا اور اس قدر بے جان کہ اس کے معاملات زندگی پر اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دنیا بن گئی اور دوسرے عالم کے تصور کو اس کی قطعاً اجازت نہ تھی کہ وہ اس کے دماغ کو پریشان کرے۔ اور اگر کبھی "سوء اتفاق" سے یہ تصور سامنے آتا بھی تو اس کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا جاتا کہ یہ "امت مرحومہ" کا حلقہ ہے، اس کے اندر داخل ہو جانا ہی حسن عاقبت کی گارنٹی ہے:

قَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا۔ انہوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، یا نصرانی ہو جاؤ بس تم ہدایت پاؤ گے

اس فریب نفس کا نشہ نزول قرآن کے وقت لوگوں پر بری طرح چھایا ہوا تھا۔ اور واقعات گواہ ہیں کہ آج اس نشہ کی مستی کچھ بڑھ ہی گئی ہے، کم نہیں ہوئی ہے، حتیٰ کہ اگر اعتراف حقیقت کی ہم میں جرأت ہو تو اس مستی کا خمار ہم خود اپنی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں سے توحید و معاد کا صحیح تصور غائب ہے اور وہ خوش آیند تمناؤں (امانی) میں غرق ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کو یہ حقیقت سنا دی ہے کہ نجات کا انحصار نہ تو گروہ مسلمین میں داخل ہونے پر ہے، نہ گروہ یہود میں، نہ گروہ نصاریٰ میں اور نہ ہی کسی اور گروہ میں۔ مدار نجات ہے توحید اور یوم آخرت کا سچا اور زندہ ایمان اور وہ حسن عمل، جو اس ایمان کی تہوں سے خود بخود ابھرتا ہے۔ (اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ) یہ آیت جہاں ایک طرف اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی طاعت و بندگی کے اعتقادی اساسات ہیں، وہاں دوسری طرف امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی ایک مجسم یادگار بھی ہے کہ کس طرح اس نے اس امت کے لیے پہلے ہی سے وہ منفذ بند کر دیا تھا جس سے پچھلی امتوں پر ضلالت، ہوا پرستی، ناخدا ترسی، شریعت الٰہی سے بے توجہی، احکام دین سے سرتابی اور فکر انجام سے بے نیازی کے فتنے ٹوٹ پڑے تھے، اور باوجود اس کے کہ اس وقت مسلمانوں کے دلوں میں اس گمراہ کن وہم کا کوئی ہلکے سے ہلکا بھی پرتو نہیں پڑا تھا مگر چونکہ آیندہ اس کا خطرہ تھا اس لیے بطور حفظ ماتقدم انہیں بھی تنبیہ کر دی کہ جس طرح مدار نجات یہودیت یا نصرانیت یا صابیت نہیں ہے اسی طرح "مسلمانیت" بھی نہیں ہے۔ پس کسی گروہ یا امت میں داخل ہو جانے ہی کو پروانہ نجات سمجھنے کی جس غلطی نے آج ان یہود و نصاریٰ کو ڈبو رکھا ہے، کہیں وہی غلطی کل تمہیں بھی نہ ڈبو دے۔ مگر وائے بدقسمتی کہ ہم نے اس تنبیہ سے بہت کم فائدہ حاصل کیا اور اپنے کارخانہ منطق و

دکلام کی ڈھلی ہوئی گولیوں سے اس بناء کو چھلنی کر ڈالنے کی کوششوں سے باز نہ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت بھی اندیشۂ حساب سے بے نیازی کے فتنوں سے محفوظ نہ رہ سکی اور انجام کار آج اس کے اندر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں ہل چکی ہیں۔ اور جب ایسا ہو چکا تو تعجب نہ کرنا چاہیے اگر اس سے تقویٰ کی روح رخصت ہو چکی ہو، اگر اسے اپنا مقصدِ حیات فراموش ہو چکا ہو، اگر اس کے دماغ سے حق کے لئے جینے اور حق ہی کے لئے مرنے کا سودا نکل چکا ہو۔

اس صورت حال پر ہم جتنا ہی زیادہ غور کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمیں یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے اندر گو یہ دونوں ہی بنیادی ایمانیات متزلزل ہو چکے ہیں مگر ایمان بالآخرت پر ہماری غفلتوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔ ایمان باللہ کا وجود ابھی اس حد تک ناپید نہیں، جس قدر کہ ایمان بالآخرت کا۔ بحیثیت مجموعی اگر امت کے ایمان باللہ کی روح کو خفتہ اور مضمحل کہا جائے تو اس کے ایمان بالآخرت کی روح کو بے حس اور مفلوج کہنا چاہیے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ پچھلی تمام امتوں میں بھی یہی کچھ صورت حالات دکھائی دے رہی ہے۔ ہم قرآن میں جس قوم کا تذکرہ بھی پڑھتے ہیں اس کو خدا کا انکار کرتے ہوئے تو نہیں پاتے مگر قیامت کے معاملہ میں قریب قریب ہر قوم کی طرف سے اسی نوع کی حیرت کا اظہار دیکھتے ہیں کہ:

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً۔ (نازعات - ۱)

کیا ہم (مرنے کے بعد زندگی کی) پہلی حالت میں پھر لوٹائے جائیں گے؟ کیا یہ اُس وقت (ہوگا)، جب کہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟

اور اگر بعض اقوام ایسی نکلیں بھی کہ انہوں نے قیامت کا اس جزم کے ساتھ انکار نہیں کیا تو ان کا قیامت کا ماننا بھی اس انداز کا تھا کہ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ماننے ہی کے مرادف تھا۔ اب جب یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے دل و دماغ میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں جمانے کی ابتدا ہی سے کوشش کی اور آخر دم تک ان جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہا، کیونکہ یہی دونوں ایمانیات دین حق کے سنگ ہائے بنیاد ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد جب اس کے پیرووں میں گمراہی نے اپنا سر نکالا تو اس کا اولین ہدف ایمان بالآخرت ہی بنا؟ ایمان باللہ کا تو کلی استیصال اس نے کبھی نہیں کیا مگر ایمان بالآخرت کے بارے میں اس نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک کہ لوگوں کے دماغ کے ایک ایک ریشے سے اس کے امکان کے تصور کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک نہ دیا؟ خدا کے بارے میں تو وہ اس بات پر آکر بالکلیہ راضی ہو گئی کہ اسے خالق کا ماننا

اور رب اعلیٰ مانا جائے، ہاں صرف شرط یہ تھی کہ اس کے نیچے بھی چھوٹی چھوٹی خدائیوں کے کچھ عہدے تسلیم کر لئے جائیں، مگر قیامت کے متعلق اس نے کسی قسم کی رواداری نہیں دکھائی اور اس کے لیے ذہن انسانی میں کسی امکان کا وہم بھی باقی رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ اس کی وجہ کا سراغ لگانے والا اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں پا سکتا کہ ......

...... نفس انسانی پر شرائع الٰہیہ کی پابندیاں ہمیشہ گراں گذرتی ہیں اس لئے وہ ہر آن ان سے راہ فرار اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے اس سعی میں قیامت کا تصور سب سے بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے تمام شیطانی حربوں اور تدبیروں کو اس رکاوٹ کے ہٹا پھینکنے میں صرف کر ڈالتا ہے، اور پھر دم اس وقت لیتا ہے جب اس رکاوٹ کو اپنے راستہ سے بالکل ہی ہٹا دے، یا اگر کچھ رعایت کرتا بھی ہے تو بس اسی حد تک جس حد تک کہ آج کل انگریزی حکومت نے "دین اسلام" کو اپنے وجود کے اظہار کی رعایت دے رکھی ہے۔ جس ایمان بالآخرت کا رشتہ انسانی زندگی کے رویہ سے یکسر کٹا ہوا ہو اس کو ایمان کہنا ایمان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

نفس امارہ نے اپنی اس سنت کا اعادہ امت محمدیہ کے اندر بھی بعینہٖ اسی طریقہ سے کیا ہے جس طرح پچھلی امتوں میں کرتی رہی ہے۔ خدا کے وجود سے انکار تو خال خال ہی نظر آتا ہے اور توحید کے اقرار سے بھی قلوب ایک بڑی حد تک معمور ہیں، مگر ایک روز جزا کے آنے کے یقین، محاسبۂ اعمال کے اندیشے اور آخرت کی باز پرس کے خوف سے دلوں کی بستیاں اس طرح اجڑ گئی ہیں جس طرح کسی زبردست بھونچال کے بعد انسانی آبادیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زبان سے قیامت کا انکار کرنے والے مسلمان آپ کو شاید ہی ملیں گے، مگر اس عدم انکار کے پیچھے خوف آخرت کے وہ کون سے عملی شواہد ہیں جن کی بنا پر آپ اس "اقرار" کو "ایمان" کہہ سکیں؟ اگر کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا کے گمان باطل نے چشم بصیرت پر تعصب کی پٹی نہیں باندھ دی ہے تو آپ کو اعتراف کرنا چاہیئے کہ آج ہم ایمان بالآخرت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خوف جزا و سزا سے بے پروا انسان کیا کرتا ہے۔ ایک دیدۂ بینا دنیا پرستی، مصلحت کوشی، افادیت پسندی اور حدود شریعت سے گریز پائی کے اس خوفناک سیلاب کا کیونکر انکار کر سکتی ہے جو دلوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور جس کے اندر ایمان بالآخرت ایک تنکے کی طرح بہتا نظر آ رہا ہے؟

یہود کی مثال یہ حقیقت، کہ خدا کے نزدیک وہی ایمان بالآخرت معتبر ہے جو اپنی پشت پر حسن عمل اور پابندی شرع

کی مضبوط شہادتیں رکھتا ہو، قرآن مجید کی مرتب کردہ اُس فردِ قرار دادِ جرم کے اندر پوری طرح نمایاں ہے جو اس نے یہودیوں کے خلاف عاید کی ہے۔ قوم یہود وہ قوم ہے جو قیامت کو زبانی طور پر ماننے اور عملی طور پر نہ ماننے کی کیفیت کی ایک تصویر ہے۔ ان یہودیوں کا کہنا تو یہ تھا کہ ایک روز جزا آنے والا ہے، اس کہنے کا تقاضا یہ تھا کہ اس دن کے لیے تیاری کرتے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے خیال سے اندیشہ ناک رہتے اور اس کے لیے احکام الٰہی کی پیروی میں بیش از بیش سرگرمی سے کام لیتے، مگر ان کی رگوں میں جو نفس پرستی اور دنیا طلبی رچ بس گئی تھی، وہ اس تقاضے کو پورا کیسے ہونے دیتی۔ اس لیے انہوں نے خدا اور اس کی شریعت کو فریب دینے کی تدبیریں کیں اور اب ایک روز جزا کے آنے کا عقیدہ اس طرح کی ایک "سیاسی تھیوری" بن گیا:-

(الف) ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ بقرہ ۱)۔ (نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا۔ بقرہ)۔

(ب) لیکن ہم اس کے بیٹے اور چہیتے ہیں (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ۔ مائدہ ۳)۔

(ج) اس لیے خواہ ہم کتنی ہی نافرمانی کریں وہ ہمیں ضرور بخش دے گا (سَیُغْفَرُ لَنَا۔ اعراف ۲۱) یا اگر کچھ سزا دی بھی تو وہ گنتی کے دنوں سے زیادہ نہ ہوگی (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً۔ بقرہ ۹)

اس سیاسی تھیوری نے ان کے لیے فسق و فجور اور دنیا پرستی کے دروازے جس طرح چوپٹ کھول دیئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح آخرت کا ماننا، نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ چنانچہ گو وہ لاکھ چلاتے رہے کہ ہم قیامت کو مانتے ہیں مگر قرآن نے ان کے اس دعوے کو بے حقیقت قرار دیا، اور ان پر کنایۃً یہ الزام لگائے بغیر نہ رہا کہ روز جزا کے یقین سے انہیں کوئی سروکار نہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کے، جس کا تخاطب یہود کی طرف ہے اور جو ان یہودیوں پر رسالت محمدی کی حجت قائم اور تمام کرتی ہے، اس کے ابتدائی پیراگراف سے مترشح ہوتا ہے، جہاں خدا کے متقی بندوں کی صفات بیان کرتے کرتے مقطع کی بات یہ کہی گئی ہے کہ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ (یعنی قرآن سے وہی لوگ ہدایت پا سکتے ہیں جو آخرت کا سچا یقین بھی رکھتے ہوں) اس جملہ میں صریحاً یہودیوں کے ادعائے ایمان پر تعریض کی گئی ہے اور ان کے اُس اُم الامراض کی طرف انگلی اٹھا دی گئی ہے جو ہدایت قرآنی سے ان کی محرومی کا اصل سبب ہے۔ یعنی یہ کہ اگرچہ قرآن سراپا ہدایت ہے مگر یہ ہدایت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو خدا پر ایمان رکھنے

ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، راہ حق میں اپنا مال خرچ کرتے ہوں اور آخر میں یہ کہ ان کے سینوں میں آخرت کا ڈر بھی ہو۔ مگر چونکہ یہ لوگ یقین آخرت سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے قرآن پر نہ وہ ایمان لائیں گے نہ قرآن کی ہدایت ان کے حق میں ہدایت ہے۔ اسی طرح قرآن جگہ جگہ ان کو جھنجھوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے سینے میرے خوف سے کیوں خالی ہو گئے ہیں، کیوں نہیں آخرت کی بے لاگ بازپرس کی تم فکر کرتے (وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ۔ بقرہ ۵۰) دنیا کے خوف اور لالچ سے تمہارے دل اٹے پڑے ہیں مگر میری دہشت یا میری محبت کا ان میں کوئی گذر نہیں، حالانکہ خوف مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے کھانا چاہیے تھا (وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ) غرض قرآن نے ان کے خلاف جو کچھ کہا ہے اس کا انداز بیان ایسا ہے جو علانیہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسے ان لوگوں کا دعوائے ایمان بالآخرت تسلیم نہیں، کیونکہ ان کی زندگی کا سارا رویہ اپنے اندر اس زبانی دعوے کی صداقت پر ایک دلیل بھی نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ ان اشقیا نے نہ جانے کب دنیا پرستی کے جوش میں اس نام نہاد عقیدۂ آخرت کے خیالی اندیشوں سے بھی اپنا دماغ خالی کر لیا اور اس وقت جو تورات ہمارے سامنے ہے اس میں اس عقیدہ کی کوئی واضح تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

پردہ کے متعلق چند عملی سوالات

سوال :- آپ کی کتاب "پردہ" کے مطالعہ کے بعد میں نے اور میری اہلیہ نے چند ہفتوں سے عائلی زندگی کو قوانین الٰہیہ کے مطابق بنانے کی سعی شروع کر رکھی ہے۔ مگر ہمارے اس جدید رویہ کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمارے والدین سخت برہم ہیں اور پردہ کو شرعی حدود و ضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر برافروختہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں، پس تسلی کے لئے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتے ہیں:-

(۱) سورہ احزاب کی یہ آیت کہ "عورتوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے .... الخ" اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ آیت میں جن اعزہ کا ذکر ہے ان کے سوا عورتوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (الّا بہ اشد مجبوری) صریحاً گناہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب بالکل برابر ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟

(۲) کیا غیر محرم اعزہ (مثلاً چچازاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں) کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لئے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟

(۳) اگر کسی غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی غیر محرم عزیز بطور مہمان آ رہے تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جا سکے گا؟ اسی طرح کسی قریبی عزیز کے ہاں جانے پر اگر زنانے سے بلاوا آئے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

(۴) اگر گھروں میں جوان ملازم کام کاج کے لئے آئیں جائیں تو سن رسیدہ عورتوں کے لئے تو جو رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے مگر جوان عورتیں کیا صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ ہو سکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟

(۵) اگر خدا و رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی کی والدہ آڑے آئیں ہو تو اس کے حکم کو رد

کیا جا سکتا ہے یا نہیں، جبکہ اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

(۶) کیا عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔

(۷) کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر یا نرس یا معلمہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ مسٹر جناح نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں ان سب کاموں میں حصہ لے کر گزشتہ نقصانات اور پسماندگی کی تلافی کریں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں اور آیا انہیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہو گا یا ضرورۃً پردہ سے باہر بھی آسکتی ہیں؟

(۸) کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں؟

جواب:- (۱) آپ نے قرآن مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، سورۂ احزاب میں نہیں ہے بلکہ سورۂ نور میں ہے اور اس میں الفاظ یہ ہیں کہ "وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا ......" یعنی بجز ان لوگوں کے اور کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں بناؤ، سنگھار اور آرائش کے ساتھ دوسرے لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔ دوسری طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی کہ "يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ......" یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر گھونگھٹ کے طور پر لٹکا لیا کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بالکل اجنبی لوگوں کے سامنے تو چہرہ کھولنا بھی درست نہیں ہے، رہے اعزہ واقربا تو ان میں سے جن لوگوں کا ذکر سورۂ نور والی آیت میں کیا گیا ہے صرف ان کے سامنے عورت پوری آزادی سے اپنی زینت کے ساتھ آسکتی ہے باقی دوسرے اعزہ واقربا کے سامنے زینت کے ساتھ آنا جائز نہیں۔

(۲) سامنے ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اُس طرح کی آزادی اور بناؤ سنگھار کے ساتھ سامنے ہونا جیسے باپ بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے، اور بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا، بولنا، حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز غیر محرم مردوں کے ساتھ جائز نہیں۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر، نیز سر کو ڈھانک کر صرف چہرے اور ہاتھ کو کسی کے سامنے ظاہر کرے، اور وہ بھی ظاہر کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ان ناگزیر ضرورتوں کی بنا پر ظاہر کرے جو مشترک خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں، مگر آزادی کے

ساتھ بیٹھ کر خلا ملا نہ کرے، خلوت میں بھی ان کے ساتھ نہ رہے، اور صرف اس حد تک سامنے ہو کہ مثلاً ان کے سامنے سے گذر جائے یا کوئی ضروری بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے۔ اس حد تک غیر محرم اعزہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم ممانعت نہیں ہے۔ بہرحال چچازاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تکلفی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعت اسلامیہ میں ان بے اعتدالیوں کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

(۳) ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جب کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدہ کے مطابق استیذان کرے (استیذان تو غیر محرم کیا، محرم مردوں کو بھی کرنا چاہئیے حتیٰ کہ بیٹوں اور بھائیوں کو بھی کم از کم گھر میں داخل ہونے سے پہلے کھنکار دینا چاہیے یا کوئی ایسی آواز کر دینا چاہیے کہ کوئی مرد گھر میں آ رہا ہے)۔ پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو چاہیے کہ کوئی چیز اوڑھ کر اپنی زینت کو چھپا لے اور ذرا اپنا رخ بدل لے یا پیٹھ موڑ لے۔ اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیز کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح بضرورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ البتہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ہنسی مذاق بالکل ناجائز ہے۔

(۴) ملازموں کے معاملہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ "غیر اولی الاربۃ" کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی برا خیال ان کے دل میں آنے کی توقع نہیں ہے) گو ان کو گھر میں آنے جانے اور کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی یہ رائے نہ ہو، ان کا گھروں میں آنا جانا جائز نہیں ہے۔ بہرحال اس معاملہ میں گھر کے قوام کا اجتہاد معتبر ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو، نہ کہ حدود شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹال دینے والا ہو۔

(۵) ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے، لیکن حکم صرف اسی ماں کا مانا جا سکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے، یعنی خدا اور رسول کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خاندانی رواجوں پر شریعت کو قربان کر دینے والی نہ ہو۔ لیکن جو ماں اس کے برعکس صفات رکھتی ہو تو اس کی خدمت تو کی جاتی رہے گی، مگر غیر شرعی

امور میں اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ شریعت کی پابندی سے آزاد ہو کر اور اپنے نفس یا برادری کی شریعت کو خدا کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا، پھر آخر اس کے پاؤں کے نیچے جنت کیسے ہو سکتی ہے!

(۶) بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پوری پابندی کے ساتھ مردوں کو خطاب کرے، لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں، صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے منشا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

(۷) جناح صاحب کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اُسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی جناح صاحب خود اور ان کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں تو پھر اسلامی تہذیب اور یوروپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو آج یوروپ میں ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اسلامی تہذیب اُس تہذیب کا نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔ البتہ اگر نظام تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقہ پر لڑکیوں کو تیار کر کے ان سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فنِ طب، سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیتِ اطفال کی تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر معلمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔

(۸) جنگ کے موقع پر تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی، پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لئے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں ----- لیکن یہ جواز اس شرط

کے ساتھ ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور اُن بدمعاشیوں سے پاک ہو جن میں آجکل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے۔ W.A.C کے معصوم نام سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لئے ان سے قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لئے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی۔

قومی فسادات کے سلسلہ میں ہمارا فرض

سوال:۔ گذشتہ دنوں یہاں کے متوقع فساد کے سلسلہ میں میں نے آپ سے جو سوالات کئے تھے ان کے جواب سے مجھے بڑی حد تک تو اطمینان ہو گیا مگر میرے ایک دوست نے چند مزید سوالات پیش کئے ہیں جو واقعی غور طلب ہیں۔ ہم ایک ہندو اسٹیٹ میں رہتے ہیں جہاں برطانوی ہند کے مقابلہ میں کتنی ہی زاید پابندیاں عائد ہیں۔ محض نماز روزہ کی آزادی ہے، اور یہ آزادی بھی برادران وطن کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ ان کو تو ہمارے نام سے نفرت ہے، اور جو مسلمان جتنا ہی زیادہ پابند شرع ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان کے بغض کا مستحق ہے۔ ان حالات میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "جماعت اسلامی کی پالیسی تو ایسے فسادات میں غیر جانبدار رہے گی اور وہ صرف مظلوم کو مظلوم اور ظالم کو ظالم کہے گی اور بوقت ضرورت بے لاگ گواہیاں دے گی۔" تو کیا ہم اس وقت تک خاموش بیٹھے رہیں جب کہ ہمیں گواہی دینے کا موقع آئے؟ شہر میں فرقہ وارانہ فساد کے شعلے بھڑک اٹھیں اور ہم دیکھتے رہیں کہ کون کس پر ظلم کرتا ہے؟ پھر جو قوم صرف مسلمان کے نام کی دشمن ہے وہ ایسے مواقع پر کیونکر ہم پر ہاتھ اُٹھانے سے باز رہے گی کہ ہم فساد میں شریک نہیں ہیں اور صرف تماشہ بین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز اگر میرے کسی مسلمان پڑوسی پر غیر مسلموں نے ظالمانہ طور پر حملہ کر دیا تو اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہوں اور اس کی جان بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈال دوں؟

موصوف یہ سوال کرتے ہوئے بطور خود کتاب و سنت کی روشنی میں اس کے دو حل بتاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر ہم مقابلہ کی قوت رکھتے ہوں تب تو اپنی مدافعت کی خاطر ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ ہم اقلیت میں ہیں اس لئے ایسی جگہ ہجرت کر جائیں جہاں ہماری اکثریت ہو۔

امید ہے کہ آنجناب ان حالات میں ہماری مناسب رہنمائی فرمائیں گے۔ ادھر ریاست کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں پچاس فی صدی بالکل جاہل اور آبا پرست اور پچیس فی صدی نیم خواندہ مگر پکے پیر پرست، بقیہ پچیس فیصدی تعلیم یافتہ مگر ان میں سے بیس علم دین سے کورے اور خانقاہیت سے متاثر اور باقی پانچ دنیا کے بندے۔

جواب ۔ آپ نے ریاست گوالیار کے مسلمانوں کی جو حالت لکھی ہے اس کو پڑھ کر افسوس ہوا، لیکن افسوس کرنے سے وہ حق ادا نہیں ہوتا جو ہم پر اور آپ پر عاید ہوتا ہے۔ بندگان خدا جس قدر زیادہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ ایک مومن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لئے کوشش کرے۔

آپ نے جن صاحب کا سوال نقل کیا ہے ان کی خدمت میں میری طرف سے عرض کر دیجئے کہ اگر سوال محض بیٹھنے اور تماشہ دیکھنے کا ہوتا تو یقیناً میرا جواب کچھ اور ہوتا۔ میں نے جو جواب اس سے پہلے متوقع فساد کے سلسلہ میں دیا تھا وہ دراصل ان لوگوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیا تھا جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی محض بیٹھ کر تماشہ دیکھنے کے لئے نہیں بنی ہے۔ اس جماعت کے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ دنیا میں خیر و عدل کا نظام قائم کرنے کے لئے جد و جہد کریں۔ اس جدو جہد میں ان کا قومی نفسانیتوں اور قومیت کے جھگڑوں سے الگ رہ کر خالص حق کے حامی و داعی کی حیثیت سے کام کرنا ضروری ہے۔ بلا شبہ عامۂ مسلمین کے ساتھ ان کا قومی تعلق ضرور ہے اور اگر عام مسلمانوں اور ان کے غیر مسلم ہمسایوں کے درمیان فی الواقع دین کی بنا پر لڑائی ہو تو اس سے الگ رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، لیکن افسوس ہے کہ نہ مسلمان دین کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور نہ وہ کشمکش، جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان برپا ہے، اس کی بنیاد یا اس کا مقصود دین ہے، اس لئے ہم اس کشمکش میں مسلمانوں کے مبتلا ہونے اور مظلوم یا ظالم بننے پر افسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور یہ ساتھ نہ دینا بھی ایسی صورت میں حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ہم محض تماشہ بیں ہونے کی حیثیت سے بیٹھے دیکھتے رہیں، بلکہ یہ اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا ہے کہ ہم مسلمانوں اور ہندوؤں اور دوسرے تمام گروہوں کو خیر اور عدل کی دعوت دیتے رہیں اور خود اپنے طرز عمل سے ثابت کرتے رہیں کہ فی الواقع نظام خیر و عدل کے قیام کے سوا کوئی غرض ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ایک شبہ اور باقی رہتا ہے، جس کو صاف کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہم خواہ کتنے ہی انصاف کے ساتھ غیر جانبدار بنیں لیکن جب تک ہمارے نام، لباس اور معاشرت دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہیں،

یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود بھی ان مظالم کے اندر رہ کر بے انصافیوں کے تختۂ مشق بننے سے بچ جائیں جو کسی مقام کی غیر مسلم اکثریت غلبہ پاتے کی صورت میں عام مسلمانوں پر کر رہی ہو؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی مقصد عظیم کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں تو اس جدو جہد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی تمام قوتوں کو صرف اسی ایک مقصد کی خدمت کے لئے وقف رکھیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جو اس مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ اس طرز عمل پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنے میں جو خطرات اور نقصانات بھی ہوں بہرحال ان کو برداشت کرنا چاہیئے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مسلمان کے لئے اس کے تحفظ کی کوئی گارنٹی اس کے اپنے اخلاق کے سوا نہیں ہے۔ عام مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس وقت جس حالت میں مبتلا کر لیا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کے لئے جینا اور مرنا چھوڑ دیا ہے اور ان اخلاق فاضلہ سے بھی کنارہ کشی کر لی ہے جو اہل ایمان کے امتیازی اخلاق تھے۔ اسی چیز نے ان کو کمزور بھی کیا اور ان کے وقار کو بھی صدمہ پہنچایا۔ اب اگر اس حالت سے آپ نکل سکتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ انہی غلطیوں میں اور انہی کے نتائج میں الجھتے چلے جائیں جو اب تک ہوتی رہی ہیں بلکہ صرف اس طرح نکل سکتے ہیں کہ جس جس مسلمان کو بھی ہوش آتا جائے وہ نفسانیت اور دنیا پرستی سے بالاتر ہو کر دعوت الی الخیر کو اپنا مشغلہ زندگی بناتا جائے اور ان اخلاق فاضلہ سے اپنے آپ کو سنوارے جو داعیان حق کے شایان شان ہو۔ جو شخص بھی ایسا کرے گا وہ اپنے گردو پیش کے سارے انسانوں پر، خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں، اپنا ایسا اخلاقی وقار قائم کر دے گا جو کسی پولیس اور فوج کی مدد سے قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم ہندو ریاست میں ہیں اور قلیل التعداد ہیں اور وہاں مسلمانوں کے لئے کوئی عزت اور امن نہیں ہے، لیکن کیا آپ بھول گئے ہیں کہ اب سے آٹھ نو سو برس پہلے خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اجمیری کی ہندو ریاست میں جب آکر مقیم ہوئے تھے تو حالات اس سے بہتر تھے یا بدتر؟ اور اس وقت کس چیز نے ان کی حفاظت کی تھی؟

میرے برادران دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمہارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے اسے ادا کرو۔

دارالکفر میں سود خواری

سوال:- ایک متدین بزرگ جو ایک یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر بھی ہیں اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

"جو تاجر یا زمیندار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہیں، اگر وہ ڈاک خانہ یا امپیریل بنک میں روپیہ جمع کرکے گورنمنٹ سے سود وصول کریں تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹیکس و لگان کے گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے"

ایک دوسرے مشہور و معروف عالم دین اس سے آگے قدم رکھ کے فرماتے ہیں:-

"قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، الغرض کسی بھی شرعی دلیل سے حربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت کوئی صاحب پیش کر سکتے ہوں تو کریں ...... افسوس کہ علمائے اسلام نے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ ادھر ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے، غالباً یہ صورتِ حالات نہ ہوتی۔ ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ سود دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں، بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت کا علاج موجود تھا لیکن انہوں نے ایک جزو پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا"

علماء کرام کی ان بحثوں نے ہم کو اس تذبذب میں ڈال دیا ہے کہ سود سے اجتناب کی جس روش پر ہم اب تک قائم ہیں کہیں وہ غلط تو نہیں ہے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہوگا کہ ایک طرف تو ہم آخرت ہی کے اجر کی امید پر دنیا میں نقصان اٹھائیں اور دوسری طرف آخرت میں جاکر ہم کو یہ جواب مل جائے کہ تمہارا سود سے اجتناب کسی شرعی حکم کے مطابق نہ تھا لہٰذا تم کسی اجر کے مستحق نہیں ہو۔

جواب:- سود کی حرمت قرآن اور حدیث کی قطعی نصوص سے بالتصریح ثابت ہے، فقہ کی کوئی اصطلاحی بحث ان نصوص کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ علماء کے ان ارشادات کے باوجود آخرت میں آپ کا اجر محفوظ ہے۔

قانون کی پیچیدہ بحثوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم ایک سیدھے سادھے مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیں تو بداہتہً یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام دین و اخلاق اور تمدن و تہذیب کے ان اصولوں کی علمبرداری کرنا ہے جنہیں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں حق کہا گیا ہے، اور دنیا سے ان خیالات اور طریقوں کو مٹانے کی کوشش کرنا ہے جنہیں قرآن اور سنت نے باطل ٹھیرایا ہے۔ جس سرزمین میں باطل کا غلبہ ہو اور احکام کفر جاری ہو رہے ہوں وہاں ہمارا کام باطل کے طریقوں کو اختیار کر لینا نہیں ہے بلکہ ہمارا اصلی منصب یہ ہے کہ ہم وہاں رہ کر قرآن کے قانونِ حیات کی تبلیغ کریں اور نظام کفر کی جگہ نظام اسلامی قائم کرنے کے لئے ساعی ہوں۔ اب غور کیجیے کہ اگر ہم خود سود کھائیں گے تو کفار کی سود خواری کے خلاف آواز کس منہ سے اٹھائیں گے؟ کفار اگر ناجائز طریقوں سے ہمارے اموال لے رہے ہیں یا حکومتِ کفر ہمارے اموال سے اگر بلا استحقاق (یعنی خدا کی سند پر مبنی حق کے بغیر) کوئی حصہ لے اڑتی ہے تو ہمارے لئے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ ہم ان اموال کو واپس لینے کے لئے ویسی ہی ناجائز کارروائیاں کرنے لگیں اور کسب حرام کو اپنا حق واپس لینے کا ذریعہ بنائیں۔ اس طرح تو سود خواری کے ساتھ شراب فروشی، مزامیر سازی، فحش فلم بنانا، عصمت فروشی، کاروبار رقص و سرود، بت تراشی، فحش نگاری، سٹہ بازی جوئے بازی اور سارے ہی حرام کاموں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر یہ فرمائیے کہ ہم میں اور کفار میں وہ کونسا اخلاقی فرق باقی رہ جاتا ہے جس کے بل پر ہم دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کر سکیں؟

اصل میں مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ حکومتِ کفر کے آئین کی رو سے تو یقیناً آپ یہ سارے ڈھنگ اختیار کرنے میں حق بجانب ہیں، لیکن شریعت اسلام کی رو سے آپ پر یہ سب حرام ہیں۔ اگر آپ شریعتِ اسلام کے پیرو ہیں تو آپ حکومتِ کفر کے آئین کی ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے۔ اور اگر آپ ایک طرف دنیا کو شریعتِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ فائدوں کے لئے یا کچھ نقصانات سے بچنے کے لئے حرام خوری کی ان گنجائشوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جو آئینِ کفر نے دی ہیں مگر آئینِ اسلام نے جن کی سخت مذمت کی ہے تو چاہے فقیہہ شہر آپ کے اس طرزِ عمل کے جواز کا فتویٰ دے دے، لیکن عام انسانی رائے اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ پھر بھی وہ آپ کی تبلیغ کا کوئی اخلاقی اثر قبول کرے گی۔

حقیقتہً اس طرزِ فکر کو فقہ اسلامی میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کہ مسلمانوں کو فلاں تکلیف اور فلاں نقصان جو

حکومتِ کفر کے تحت رہتے ہوئے پہنچ رہا ہے، اسے روکنے کے لئے نظام باطل ہی کے اندر کچھ "شرعی" وسائل پیدا کئے جائیں - یہ طریقِ فکر مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اسلام کو بدلتا ہے، یعنی تجدید دین کی جگہ تجدد کا دروازہ کھولتا ہے جو نظام دینی کے لئے حد درجہ تباہ کن ہے، اور افسوس یہ ہے کہ غلبۂ کفر کے زمانہ میں فتویٰ نویسی کچھ اسی راہ پر چلتی رہی ہے جس نے مسلمانوں کو نظام باطل کے تحت رضا و اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا دیا ہے۔ ہم اس طرزِ فکر کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، چاہے کتنے ہی بڑے بڑے علما اس کے حامی ہوں ۔ نظام باطل کے تحت مسلمانوں کے لئے تکلیف اور نقصان کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اس تکلیف اور نقصان کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان نظام طاغوت کو ختم کرنے کے لئے جہاد کی فکر کریں، نہ یہ کہ کفر کے زیر سایہ کسی قدر سہولت سے جینے کے لئے شریعت کو موافق حال بنائیں۔

چند کاروباری مسائل

سوال:- ایک تاجر اپنے کاروبار میں پوری طرح راست باز اور دیانت دار ہے اور احکام شریعت کی پابندی کرتا ہے۔ سامانِ تجارت اسے کنٹرول ریٹ پر حاصل ہوتا ہے، لیکن بازار میں چور بازاری کی وجہ سے بعض اشیاء کی قیمتیں بہت چڑھی ہوئی ہیں، اس صورت میں کیا وہ مروجہ نرخ پر اپنا مال فروخت کرنے کا حق رکھتا ہے؟

جواب:- کنٹرول ریٹ سے خریدا ہوا مال کنٹرول ریٹ پر ہی بیچنا چاہئے۔ کنٹرول ریٹ پر خرید کر بلیک مارکیٹ میں مال فروخت کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کے اندر نفع اندوزی کی حرص کے سوا اور کوئی شریفانہ جذبہ باقی نہیں رہا۔ البتہ اضطراراً وہ چھوٹے تاجر ایک حد تک بلیک مارکیٹنگ کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں جنہیں مالِ تجارت ملتا ہی بلیک مارکیٹ سے ہو اور کنٹرول ریٹ پر حاصل ہونا ناممکن ہو جائے، نیز انہیں کوئی دوسرا مشغلہ یا پیشہ اختیار کرنے کی بھی استطاعت نہ ہو۔

سوال:- اگر کوئی دوکاندار اس اصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیا کی کم قیمت لے اور ادھار لینے والے سے زیادہ تو کیا وہ سود خواری کا مرتکب ہوگا۔ ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی

ہے کہ فروخت پر کچھ معمولی سا کمیشن رکھا جاتا ہے، مثلاً ایک پیسہ فی روپیہ، اور یہ صرف نقد خریداری کی صورت میں گاہک کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے۔ رہی دوسری شکل تو اگرچہ اصطلاحاً یہ سود کی تعریف میں نہیں آتی، لیکن اس کے اندر روح تو سود ہی کی موجود ہے۔ فقہ کی زبان میں یہ ربوا نہیں ہے مگر "ربیہ" ضرور ہے اور ربیہ بھی پرہیز کے لائق چیز ہے۔

سوال:- ہمارے شہر میں اور عام طور پر ملک بھر میں ارباب تجارت کا طریق کار یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو چنگی سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اول تو چوری چھپے مال دکان پر پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ نہ ہو سکے تو محرر چونگی کو کچھ دے دلا کر کام چلاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم مال ظاہر کرنے والے نقلی بیجک بنا کر اس کے مطابق کم چونگی ادا کرتے ہیں اور دکان کے رجسٹروں میں اسی نقلی بیجک کے مطابق اندراجات کرتے ہیں۔ وہ مال رجسٹروں میں دکھایا ہی نہیں جاتا جس پر چونگی ادا نہ کی گئی ہو۔ اس طرح مال کی آمد بکری اور منافع سبھی واقعی سے کم دکھائے جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقے جائز ہیں؟

جواب:- معاملہ کی اس پوری شکل کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ موجودہ نظام حکومت کے عائد کئے ہوئے ٹیکس بجائے خود ناجائز ہیں اور ناروا اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں، لیکن اس استحصال ناجائز سے بچنے کے لئے جھوٹ اور جعل و فریب اور رشوت کے ہتھیار استعمال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اس طرح اپنے مال کو تو بچایا جا سکتا ہے لیکن متاع اخلاق برباد ہو جائے گی اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگوں کے اندر وہ اخلاقی حس ہی مفقود ہونی شروع ہو جائے گی جو انسان کو اپنے معاملات میں صداقت و دیانت سے کام لینے پر آمادہ کرتی ہے۔

سوال:- ریلوے اسٹیشنوں سے جب مال کی بلٹیاں چھڑوانے جاتے ہیں تو ریلوے کے کلرک رشوت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جسے اگر رد کیا جائے تو طرح طرح سے نقصان اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایک مومن تاجر کیا کرے؟

جواب:- عجیب معاملہ ہے کہ یہ لوگ جب حکومت سے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس بڑھوانے کے لئے ہڑتالیں

کرتے ہیں تو پبلک کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب اُدھر سے اپنا کام نکال لیتے ہیں تو اسی پبلک کو طرح طرح سے پریشان کرکے اس کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ درحقیقت یہ نہایت ضروری ہے کہ ان لوگوں کو صاف صاف متنبہ کردیا جائے کہ اگر تم پبلک کے ساتھ ایماندارانہ رویہ اختیار نہ کروگے تو اپنے مطالبات میں پبلک سے کسی ہمدردی کی توقع نہ رکھو۔

رہا نفس سوال تو اس کے متعلق پہلے بھی میں یہ بیان کرچکا ہوں کہ حکومت کے ملازموں سے ناروا فائدے اٹھانے کے لئے ان کو رشوت دینا تو قطعی حرام ہے، لیکن اگر اپنے جائز حقوق بھی آپ ان کو رشوت دیئے بغیر نہ حاصل کرسکیں، اور ان کا نقصان بھی آپ کے لئے قابل برداشت نہ ہو، نیز اس قسم کے رشوت خور ملازموں کی شکایت ان کے افسروں سے کرنے کا بھی موقع نہ ہو یا اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو، تو مجبوراً ان کو رشوت دیجئے اور ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے رہیئے کہ یہ حرام خوری ہے جو تم کررہے ہو اور تمہارا اپنا بھلا اسی میں ہے کہ تم اس سے بچو!

سوال:- آڑھت کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ آڑھتی کے پاس دو قسم کے بیوپاری آتے ہیں۔ پہلی قسم کے بیوپاری اپنے سرمایہ سے کوئی جنس خرید کرلاتے ہیں اور آڑھتی کی وساطت سے فروخت کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے بیوپاری وہ ہوتے ہیں جو کچھ معمولی سا سرمایہ اپنا لگاتے ہیں اور بقیہ آڑھتی سے اس شرط پر قرض لیتے ہیں کہ اپنا خریدا ہوا مال اسی آڑھتی کے ہاتھ فروخت کریں گے اور بوقت فروخت مال آڑھتی کا روپیہ بھی ادا کردیں گے۔ آڑھتی پہلی قسم کے بیوپاریوں سے اگر ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا ہے تو اس دوسری قسم کے بیوپاریوں سے دو پیسہ فی روپیہ لے گا۔ یہ صورت حرام ہے یا جائز؟

جواب:- یہ فرق جو آڑھتی اپنے کمیشن میں رکھتا ہے، غلط ہے۔ قرض لینے والے سے دو پیسہ اور قرض نہ لینے والے سے ایک پیسہ فی روپیہ آڑھت لینا تو ربوا کی تعریف میں آجاتا ہے۔ چاہیئے یہ کہ قرض کا معاملہ الگ رہے اور مال کی فروخت کے لئے ایجنٹ کی حیثیت سے کمیشن لینا بالکل الگ ہے۔ البتہ یہ پابندی جائز ہوسکتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ پر بیوپاری اپنا مال خاص اسی آڑھتی کے ہاتھ لاکر فروخت کیا کرے جس کے روپیہ سے وہ کاروبار چلا رہا ہے۔

سوال :- آڑھتی بائع اور خریدار سے کمیشن لینے کے علاوہ ایک حرکت یہ بھی کرتا ہے کہ مال کا سودا ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ مقدار "چونگی" کے نام سے لے لیتا ہے، مثلاً پھل ہوں تو ان میں سے چند دانے لے لیگا اور سبزی ہو تو اس میں اپنا حصہ لگائے گا۔ اس چونگی کی حیثیت کیا ہے؟

جواب :- یہ چُنگی لینا آڑھتی کی زیادتی ہے۔ وہ جب اپنا طے شدہ کمیشن لے چکا تو اب اسے اور کچھ لینے کا حق نہیں۔ حقیقت میں یہ "دست درازی" ہے جس کا ایک معصوم نام "چُنگی" رکھ لیا گیا ہے۔

سوال :- میں جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر اس سے کافی متاثر ہوں، ذہن کا سانچہ بدل چکا ہے اور یہ سانچہ موجودہ ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگار نہیں ہو رہا۔ مثلاً ایک اہم الجھن کو لیجئے۔ ہمارا آبائی پیشہ زمینداری ہے اور والد صاحب نے مجھے اسی پر مامور کر دیا ہے۔ زمینداری کا عدالت اور پولیس وغیرہ سے چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ عدالت اور پولیس سے بے تعلقی کا اظہار زمیندار کی کامل معاشی موت ہے حد یہ کہ عدالت اور پولیس کی پشت پناہی سے بے نیاز ہوتے ہی خود اپنے ملازمین اور مزارعین پر زمیندار کا کوئی اثر نہیں رہ جاتا۔ خود پولیس جب یہ دیکھتی ہے کہ کوئی زمیندار اس کی "بالائی آمدنی" میں حائل ہو رہا ہے تو وہ اسی کے مزارعین اور ملازمین کو اکسا کر اس کے مقابلہ پر لاتی ہے۔ اسی طرح عدالت کا ہوا جہاں کارندوں کے سامنے سے ہٹا، پھر ان کو ضمیر کی آواز کے سوا کوئی چیز فرائض پر متوجہ نہیں رکھ سکتی اور حال یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے مادی فائدہ سے بڑھ کر کسی شے میں اپیل نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ایک مثال کافی ہو گی۔ ہمارے یہاں دستور تھا کہ کارندوں کے کام میں نقص رہے یا وہ کسی قسم کا نقصان کر دیں تو ان سے تاوان وصول کیا جاتا تھا۔ ہم نے یہ تاوان وصول کرنا بند کر دیا کیونکہ پولیس کی مدد کے بغیر یہ سلسلہ چل نہیں سکتا۔ روپے کی اس تبدیلی کے ساتھ معاً کاشتکاروں نے نقصان کرنا شروع کر دیا اور کارندوں نے بھی جرمانہ کی رقم میں سے جو حصہ ملتا تھا اس سے مایوس ہو کر چشم پوشی اختیار کی۔ اب حالات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میں زمینداری کو سرے سے ختم کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ آپ کی رائے میں چارۂ کار کیا ہے؟

جواب :- زمینداری میں پولیس اور عدالت سے تعلق رکھنے کی جو ضرورت اس کافرانہ نظام میں پیدا ہو گئی ہے اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ قانون کی حدود سے بے نیاز ہو کر ایک زمیندار کو کتنا نقصان پہنچ

سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو دعوتِ اسلامی کا کام کرنا ہو اسے اپنے جملہ معاملات، قانون کے سہارے کے بجائے اخلاقی بنیادوں پر قائم کرنے چاہئیں اور اس سلسلہ میں جو نقصانات بھی پہنچیں انہیں برداشت کرنا چاہئے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا اپنا کام ہے کہ آیا آپ دعوتِ اسلامی کا کام کریں یا قانون کے سہارے زمینداری چلائیں۔ بہرحال یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں نبھ سکتے۔ جن لوگوں پر آپ پولیس اور عدالت کے ذریعے سے اپنی زمینداری کا زور چلائیں گے وہ آپ کے اخلاقی اثر سے کبھی متاثر نہیں ہو سکتے اور نہ آپ کی اس دعوت میں کوئی صداقت محسوس کر سکتے ہیں کہ حکم صرف اللہ کے لئے ہے اور قانون صرف خدا کا چلنا چاہیے۔

سوال:- کیا بچوں کے کھیل کا سامان، مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، ربڑ کی چڑیاں اور لڑکیوں کے لئے گڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے، نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی کیا بیچی جاسکتی ہیں؟

جواب:- بچوں کے کھلونے بیچنا فی الجملہ تو ناجائز نہیں ہے الا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسمے تو ان کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خدوخال کے ساتھ انہیں بنایا گیا ہو، دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری سا ڈھانچہ کسی جاندار کا ہو۔ جیسے لکڑی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسموں کی فروخت جائز نہیں ہے اور دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں اگر مشرکانہ تخیلات کی نمائندہ ہوں، مثلاً کرشن جی کی مورتی یا رام چندر کا مجسمہ وغیرہ تو ان کی فروخت حرام ہے۔

سوال:- اشتہار کے لئے کیلنڈروں وغیرہ پر آج کل عورتوں کی تصاویر بنانے کا بہت رواج ہے، نیز بعض مشہور شخصیتوں اور قومی ہیروؤں کی تصاویر بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں مختلف تجارتی اشیاء کے ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر بھی تصاویر چھاپی جاتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں سے ایک مسلمان تاجر اپنا دامن کیسے بچا سکتا ہے؟

جواب:- اگر کوئی اشتہار یا کیلنڈر خود آپ چھپوائیں تو اسے تصویر سے پاک رکھیں۔ اور ضرورتاً اگر آپ کو کیلنڈروں وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے تو اول تو بے تصویر لیجئے، ورنہ تصاویر کو چھپا دیجئے یا مسخ کر دیجئے۔ لیکن ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر آپ کہاں تک تصاویر کو مٹا سکتے ہیں۔ موجودہ تصویر پرست دنیا نے قسم کھالی ہے کہ کسی

چیز کو تصویر سے خالی نہ چھوڑے گی۔ ڈاک کے ٹکٹوں اور سکوں تک پر تصاویر موجود ہیں۔ یہ ہمہ گیر نظام طاغوت اپنی ناپاکیوں اور غلاظتوں کو جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ بس اپنی حدِ امکان تک اپنا دامن بچائیے اور اس حد سے آگے جو کچھ ہے اس سے اپنے آپ کو اور دنیا کو بچانے کے لئے یہ سعی کیجئے کہ نظام باطل کا تسلط ختم ہو اور نظام حق کا اقتدار جمے۔ اس کی جڑ کٹے گی تو شاخیں آپ ہی جھڑ جائیں گی۔

سوال:۔ ہر گاؤں میں عموماً ایک لوہار اور ایک بڑھئی ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے زمیندار کام لیتے ہیں اور معاوضہ نقد ادا نہیں کرتے، نہ تنخواہ دیتے ہیں، بلکہ فصل کے فصل ایک مقررہ مقدار غلہ کی انہیں دیدی جاتی ہے۔ اس صورت معاملہ کو "سیپ" کہا جاتا ہے۔ زمیندار لوگ جب کبھی لوہے یا لکڑی کا کوئی سامان خریدنا چاہتے ہیں تو اپنے لوہار یا بڑھئی کو اپنے ساتھ شہر لے جاتے ہیں تاکہ وہ اچھا مال خرید وا دے۔ یہ لوہار یا بڑھئی بعض کارخانوں اور دکانوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور وہاں سے سامان خرید واتے ہیں اور ہوتا یوں ہے کہ یہ لوگ دکان پر جاتے ہی آنکھوں کے اشاروں سے دلالی کی فیس دکاندار سے طے کر لیتے ہیں جس سے زمیندار بے خبر رہتا ہے۔ اگر دکاندار لوہار یا بڑھئی کی دلالی کا کمیشن ادا نہ کرے تو پھر وہ کبھی بھی اپنے زمینداروں کو اس کی دکان پر نہ لائے گا بلکہ کسی دوسری جگہ ساز باز کرے گا۔ اور جو دوکاندار ان کا کمیشن دینے پر راضی ہو وہ خراب مال بھی اگر دکھائے تو یہ خاص قسم کے دلال اس کی تعریف کریں گے اور اسے بکوانے کی کوشش کریں گے۔ یہ سازش اگر زمیندار پر آشکارا ہو جائے تو وہ اپنے بڑھئی یا لوہار کو ایک دن بھی گاؤں میں نہ رہنے دے۔ یہ صورت معاملہ کیسی ہے؟

جواب:۔ "سیپ" معاملہ کی ایک ایسی شکل ہے جو دیہاتی زندگی میں "معروف" کی حیثیت پیدا کر چکی ہے، اس لئے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس میں بیگار کا عنصر شامل نہ ہونے پائے، یعنی فی الواقع جن لوگوں سے جتنی خدمت لی جائے ان کو اس کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔ مقررہ خدمات سے زائد کوئی کام لینا ہو تو اس کا حق الگ اسے دینا چاہیئے۔ محض زمینداری کی دھونس میں لوگوں سے بے جا خدمت لینا ظلم ہے۔

دلالی کی جو شکل آپ نے لکھی ہے اس کے ناجائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا، مگر واقعہ یہ ہے

کہ یہ دراصل زمینداروں کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ پیشہ ور لوگ محض ان کے دباؤ سے مجبوراً اپنے کام کاج کا ہرج کر کے ان کے ساتھ مال خریدوانے جاتے ہیں اور اس کا معاوضہ دکانداروں سے گویا اس قرارداد پر وصول کرتے ہیں کہ اگر تم ہمیں کمیشن دیتے رہو گے تو ہم تمہارا برا مال بھی ان زمینداروں کے ہاتھ بکوا دیں گے۔ اس طرح یہ مال فروخت کرانے والا، اور دکاندار، اور ان کے ساتھ زمیندار بھی، تینوں ایک ایک قسم کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر زمیندار ان لوگوں سے مفت کی خدمت لینا چھوڑ دیں اور انصاف کے ساتھ ان کا حق المحنت انہیں دیا کریں تو یہ بداخلاقی رونما نہ ہو

سوال:- چمڑے کے کاروبار میں کروم ایک ایسی چیز ہے جس پر فٹ کی پیمائش کا اندراج بہت غلط ہوتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کلکتہ میں تیار ہوتا ہے۔ مال تیار کرنے والے ہر تھان پر اصل پیمائش سے زائد فٹ لکھ دیتے ہیں مثلاً دس فٹ کے تھان کو بارہ فٹ ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ کے تاجر یہ مال خریدتے ہیں اور یہ کچھ اور فٹ بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب باہر کے تاجر اُن سے مال خریدنے جاتے ہیں تو پھر وہ مزید فٹ بڑھاتے ہیں۔ یہاں اگر تھان پر فٹوں کا پکا اندراج ہو جاتا ہے اور پھر آخر تک یہی اندراج قائم رہتا ہے۔ صحیح فٹ والا مال مارکیٹ میں نہیں ملتا، تقریباً سبھی کارخانے اور تاجر یہی کچا فٹ استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر گاہک اس صورتِ حال سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہم پیمائش کی اس گڑبڑ کے متعلق کوئی توضیح نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی گاہک پوچھے تو اسے صاف بتا دیتے ہیں کہ اس مال پر کچے (یعنی غلط) فٹوں کا نمبر لگا ہوا ہے۔ ہم اسی کچے فٹ کے حساب سے خریدتے ہیں اور اسی کے حساب سے منافع لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کچا فٹ اگر ۱۲ ر میں آتا ہے تو ہم ایک کچے فٹ کے ۱۲، ر لگائیں گے۔ شرعاً ایسے کاروبار کی کیا حیثیت ہے۔

جواب:- تجارت میں جو چیز معروف ہو، یعنی دکاندار اور خریدار سب اس بات سے واقف ہوں کہ کچے اور پکے اوزان یا پیمانوں میں کیا فرق ہے اور کونسی چیز پکے پیمانوں کے حساب سے ملتی ہے اور کونسی کچے پیمانوں کے حساب سے تو اس صورت میں یہ معاملہ جائز شمار ہوگا۔ لیکن یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ گوناگوں اوزان اور پیمانے رائج رہیں۔ اس سے ناواقف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ایک اچھے نظامِ حکومت کا فرض ہے کہ وہ تجارت کو ان "اسرارِ نہاں" سے پاک کرے۔

مطبوعات

تبلیغ حق مترجمہ مولانا محمد علی صاحب مظفری۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ (غیر مستطیع حضرات ڈاک خرچ بھیج کر مفت منگا سکتے ہیں) ملنے کا پتہ: ادارہ اشاعت اسلامیات۔ حیدر آباد، دکن۔

یہ کتاب ایک فارسی تصنیف "البلاغ المبین" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف کی حیثیت سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر یہ انتساب اپنی پشت پر کوئی مضبوط شہادت نہیں رکھتا۔ کتاب پیر پرستی اور قبر پرستی کی تردید اور قرآنی توحید کی توضیح میں لکھی گئی ہے۔ مصنف کا زاویۂ بحث و نظر خالص اسلامی اور قرآنی ہے اور انھوں نے کتاب، سنت، آثار، اسوۂ صحابہ اور علماء و صوفیائے حق کے اقوال کی روشنی میں پیر پرستی اور اس کے تمام مشرکانہ اعمال، مثلاً فنا فی الشیخ، استمداد بالقبور، غیر شرعی طریق توسل وغیرہ بدعات کی مدلل تردید فرمائی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ ترجمہ اچھا اور معنی خیز ہے۔ بظاہر بعض جگہ جزوی فروگذاشتیں بھی محسوس ہوتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ کتاب کی افادیت پر اس کا کوئی اثر پڑے۔ مترجم کے اپنے قائم کیے ہوئے عنوانات البتہ کافی اصلاح اور نظر ثانی چاہتے ہیں۔ رہ گئیں کتابت کی غلطیاں، تو یہ حیدر آبادی مطبوعات کا ایک عام مرض بن چکی ہیں۔

شمائل الاتقیاء تالیف خواجہ شیخ رکن الدین عماد کاشانی رح۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ: مہتمم اشاعت العلوم۔ حیدر آباد۔ دکن۔

یہ ضخیم کتاب، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، علم تصوف سے تعلق رکھتی ہے اور فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کے چار باب ہیں۔ پہلے باب میں طریقت و اصحاب طریقت کے افعال و مقامات کی، دوسرے میں "ارباب حقیقت یعنی انبیاء و اکابر اولیاء کے احوال" کی، تیسرے میں ذات و صفات الٰہی اور اس کے متعلقات کی، نیز حضرت خاتم الانبیاء اور ان کی امت کے حالات و فضائل کی، اور چوتھے باب میں حضرت آدم کی خلقت اور ان کے، نیز ان کی ذریت کے اوصاف کمال کی تشریح کی گئی ہے۔ مولف کی وسعت نظر کا اعتراف کیے بغیر

نہیں رہا جا سکتا۔ انھوں نے تفسیر، حدیث۔ فقہ اور تصوف کی صدہا کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ کتاب مرتب فرمائی ہے اور جس کتاب سے جو اقتباس بھی لیا ہے اس کا حوالہ پہلے ہی دیدیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے شاذ و نادر ہی کچھ تحریر کیا ہے۔ ورنہ قریب قریب تمام کی تمام کتاب دوسرے ہی اکابر صوفیہ کے اقوال و آرا کا مجموعہ ہے۔

ہم نے اس کتاب کے جستہ جستہ مباحث دیکھے۔ کچھ باتیں تو ہم جیسے عامیوں کے حافظہ و فہم و ادراک سے بہت ہی دور معلوم ہوئیں۔ مگر جو باتیں ہماری سمجھ میں آئیں ان کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں "رطب" کے ساتھ "یابس" کا بھی ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ جن نصوص قرآن و سنت کو نظریات تصوف کی تائید میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے اکثر تحریف معنوی اور باطنیت کی تیغ ستم کی فریادی ہیں۔ بطور مثال حدیث من قتل قتیلا فلہ سلبہ سے اس استدلال کی جرأت کرنا کہ اگر کوئی شخص سماع کے وقت وجد میں آکر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے تو وہ شرعاً قوال کا حصہ ہیں، کوئی معمولی جسارت نہیں۔

دیدار الٰہی مترجمہ مولانا غلام ربانی لودھی۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:۔ شیخ محمد قمر الدین، موچی دروازہ، لاہور۔

امام ابن قیمؒ کے مشہور شاگرد حافظ ابن رجب حنبلی نے حدیث "اختصام الملأ الاعلیٰ" کی ایک مفصل شرح لکھی ہے، جس میں انھوں نے بعض ان مسائل پر، جن کو روح دین کہنا چاہیے، اچھی خاصی تحقیقی اور تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ بزرگوں کے واقعات خواب کا ذکر البتہ کتاب کی علمی حیثیت کے منافی ہے۔

یہ کتاب اسی شرح کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ سادہ ضرور ہے مگر نہایت سرسری اور پھیکا۔ عربی کے محاورات کا محض لفظی ترجمہ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کتاب کا نام بھی کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس میں کوئی ایسی جامعیت نہیں جو تمام مضامینِ حدیث مذکورہ پر حاوی ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا ذکر تو اس حدیث میں صرف ایک ضمنی حیثیت سے آیا ہے۔ اصل مقصود تو وہ تعلیمات ہیں جو اس لقائے الٰہی کے وقت حضور کو ملیں۔

مسئلۂ تصویر ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶/ ملنے کا پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

اس کتابچہ میں دو مضمون شامل ہیں۔ ایک تو مدیر ترجمان القرآن کا بعنوان "فوٹو کا مسئلہ" جو رسالہ ترجمان القرآن کی کسی گذشتہ اشاعت میں "رسائل و مسائل" کے تحت شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا ...... مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی کا بعنوان "تصویر علم و عقل کی روشنی میں" جو رسالہ "الفرقان" میں شائع ہو چکا ہے۔ پہلا مضمون مختصر اور دوسرا مفصل ہے۔ ان کے پڑھنے سے ایک مسلمان کو تصویر کشی و تصویر بینی کے متعلق اسلامی احکام معلوم ہونے کے علاوہ ان احکام کی حکمت و مصلحت بھی پورے طور پر ذہن نشین ہو جائے گی۔

روح حیات از جناب اختر قریشی صاحب۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ: ادارہ نشریات اردو۔ حیدرآباد۔ دکن۔

اختر قریشی صاحب اردو کے نوجوان ادیبوں میں سے ہیں۔ ایک ادبی رسالہ "سفینہ" کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ یہ کتاب ان کے مختلف خطوط کا مجموعہ ہے، جن میں انھوں نے سماج اور موجودہ مذہبیت کے خلاف اپنے باغیانہ افکار بڑی بے باکی سے بیان کیے ہیں۔ ہم اس بے باکی گفتار پر انھیں داد تو دے سکتے ہیں مگر اسلامی مسائل کے بارے میں ان کے انداز فکر و نظر کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس پر زمانہ حاضر کے بے لگام تجدد کی ایک ہلکی سی ترچھی نظر آتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ترکی کی رفتار ترقی پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس پر، ایک مسلمان ہوتے ہوئے، بجائے بے چینی کے، ایک فخر اور ایک اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

یوں اس کتاب کی زبان میں ادبی نزاکتیں اور شوخیاں سراہنے کے قابل ہیں، مگر حیدرآباد کے مخصوص محاورات دوسروں کے مذاق پر گراں ضرور گذرتے ہیں۔ مزید غضب یہ ہے کہ "ق" کو "خ" اور "خ" کو "ق" بولنے کا جو رواج وہاں ابھی تک صرف تقریر و گفتگو کی حد تک تھا وہ اب اس کو پھاند کر تحریر کی مملکت میں بھی گھستا نظر آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں "پر قینچ" کو بڑی بے تکلفی سے "پر خینچ" کر دیا گیا ہے۔

(ص - ا)

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-
رسالہ دینیات	۱/۸
حقوق الزوجین	۱/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸
مسئلہ جبر و قدر	۱/-
تجدید و احیائے دین	۱/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-
پردہ	۲/۸
تنقیحات	۲/۸
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-
تفہیمات	۳/۸
حقیقت توحید	۱/۲
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-
اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
سود	۲/۸
اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	(زیر طبع)
دین حق	-/۶/-
اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
ایک اہم استفتا	-/۳/-
دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-
دین حق	۱/-
انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلام اور جاہلیت	۱/-
شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)

سرورق مطبوعہ دین پریس لاہور